کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند (اقبالؒ)

آزادی کشمیر کا نعرہ

یعنی

حضرت مولینا محمد سعید صاحب مسعودی جنرل سکریٹری نیشنل کانفرنس

کا

بیان

جو مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو مسٹر اندر بھوشن مجسٹریٹ سرینگر کی [illegible] ۱۹۴۶ء ... گیا

[illegible] آواز قصور

پیش لفظ

سلطنت بتقصیر دارد ازدفاع [illegible]

از خواجہ غلام محمد صاحب صادق ممبر ورکنگ کمیٹی نیشنل کانفرنس

یہ مجموعہ جو حضرت مولٰینا محمد سعید صاحب مسعودی جنرل سکریٹری آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کے اس بیان پر مشتمل ہے۔ جو عدالت میں پڑھا گیا تھا۔ قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے مجھے اس پر کسی طویل تمہید کے اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

یہ بیان نیشنل کانفرنس کے ایک عام کارکن یا رہنما کا بیان نہیں بلکہ اس کانفرنس کے جنرل سکریٹری کا ذمہ دارانہ بیان ہے۔ جس میں نیشنل کانفرنس کے نصب العین اور اس کے پروگرام کی نسبت جو کچھ کہا گیا ہے۔ پوری ذمہ داری اور کامل تحقیق کی بنا پر کہا گیا ہے اور "کشمیر چھوڑ دو" تحریک شروع ہونے کے وقت اس نعرے کی نسبت موافق و مخالف حلقوں میں جو اختلافات تھے۔ وہ اس بیان کے بعد دور ہو جانے چاہئیں۔ کیونکہ اس بیان نے "کشمیر چھوڑ دو" کے مفہوم کو غیر مبہم الفاظ میں متعین کر دیا ہے۔ عدالت کے سامنے ملزم کا بیان عدالت کا فیصلہ حاصل کرنے کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ مولٰینا محمد سعید صاحب مسعودی نے بھی جب عدالت کے سامنے اپنا بیان پیش کیا۔ تو ڈرامے کی ظاہری صورت یہی تھی کہ بیان دہندہ ملزم مسٹر اندو بھوشن مجسٹریٹ سے اپنے مافی الضمیر کی نسبت فیصلہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بیان پر فیصلہ دینا مسٹر اندو بھوشن ہی نہیں۔ غیر ذمہ دار نظام حکومت کے کسی بھی بڑے بڑے مجسٹریٹ کے حد امکان سے باہر تھا۔ اس پر موجودہ حالات میں صحیح فیصلہ وہی مجسٹریٹ صادر کر سکتا تھا جو فیصلے پر دستخط ثبت کرنے کے بعد بیان دہندہ ملزم کے ساتھ ہی جیل کے دروازے سے اندر چلے جانے پر اپنے آپ کو آمادہ کر سکے۔ اور یہ امید ہر شخص سے نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے اس بیان پر جو فیصلہ دیا گیا ہے (اور جو بیان کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے) اس کی حیثیت ایک رسمی فیصلے سے زیادہ نہیں جو کچھ بھی ہے۔ وہ اس لئے نہیں کہ نیشنل کانفرنس کے جنرل سکریٹری نے بیان کیا دیا ہے

لئے ہے کہ دفعہ ۵ اور ۳۲ کی خلاف ورزی اور ملزم کا نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا رکن ہونا اس کو ملک کی وزارت کی نگاہوں میں اسی سزا کا مستحق قرار دیتا تھا۔

ورنہ اصل بیان کی بنا پر اگر فیصلہ دینا مقصود ہوتا۔ تو وہ یقیناً موجودہ فیصلے سے مختلف ہوتا۔ بہر صورت مجسٹریٹ کا فیصلہ کچھ ہو ملزم کا بیان بجائے خود کئی فیصلوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں وہ کشمیر کی تین سو ساٹھ سال کی غلامی کے خلاف فیصلہ ہے مغل سلطنت کے امپریلزم کے خلاف فیصلہ ہے۔ پٹھانوں کے ظلم و تشدد کے خلاف فیصلہ ہے۔ سکھوں کی تاخت و تاراج کے خلاف فیصلہ ہے۔ اور سب سے بڑھ کر ڈوگرہ راج اور اس کی قائم کردہ جاگیرداری اور سرمایہ داری۔ غیر دیانتدارانہ اور لٹیرانہ نظام حکومت کے خلاف فیصلہ ہے۔ اور کاک وزارت کے ظلم و تشدد، فرقہ پروری اور مکاری و عیاری کے خلاف تو جو فیصلہ اس بیان میں دیا گیا ہے۔ وہ رہتی دنیا تک تاریخ کشمیر کا کبھی نہ بھولنے والا باب بن کر زندہ رہے گا۔ اتنے گوناگوں فیصلوں پر مشتمل بیان پر موجودہ فرسودہ دور کے کسی جج سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اس کی نسبت صحیح فیصلہ دے سکتا ہے۔ ایک بے جا توقع ہے۔

جنرل سکریٹری کے اس بیان کو ملک کے عوام اور نوجوانوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے میں صرف ایک ہی استدعا کرتا ہوں کہ اور وہ یہ کہ انہوں نے کشمیر اور اس کی تاریخ کو اب تک مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے جانچا ہوگا۔ آج پہلی بار وہ کشمیر کی تین سو ساٹھ سال کی محکومیت کے دور کی تاریخ کو اس نئے نقطہ نگاہ سے پرکھنے کی کوشش کریں۔ جس کی طرف اس بیان میں رہنمائی کی گئی ہے۔ اور ہماری پچھلے سولہ سال کی تحریک آزادی کا جو تجزیہ اس بیان میں کیا گیا ہے۔ اس سے برآمد ہونے والے نتائج کی روشنی میں اپنی راہ عمل معین کریں۔ تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے آپ کو منزل آزادی کے صحیح راستہ پر پائیں گے۔

(غلام محمد صادق)

...ر چھپکر کشمیر بلڈنگ لاہور سے شائع ہوئی

ابوالبشیر مولانا محمد سعید مسعودی
جنرل سیکریٹری آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس

بیان کی ضرورت

استغاثہ کے پیش کردہ الزامات اور شہادت کی نسبت عدالت کے سوالات کا جواب صرف "ہاں"، "نہ" اور "درست ہے" یا "غلط ہے" دے دینا کاروائی کی خانہ پری اور ضابطے کے رسوم و قیود کی تکمیل کے لئے کافی تھا۔ اور صرف اس مقصد کے لیے کسی قسم کے لمبے چوڑے تحریری بیان کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن میرے جس فرض نے مجھے ۵ جولائی ۱۹۴۶ء (۲۲ ہاڑ سمت ۲۰۰۳) کو حضرت بل میں حکومت کشمیر کے قوانین اور احکام کی پابندیاں توڑنے اور عوام سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔ وہی فرض اس مرحلہ پر بھی متقاضی ہے کہ میں اپنی "ملزمیت" اور "مجرمیت" کی نسبت اس عدالت کے سامنے قدرے تفصیل سے گفتگو کروں۔

اس بیان کے دوران میں مجھے اپنی دانست کے مطابق کشمیر اور جموں کے عوام کے منزلِ مقصود اور ان کے ماضی و حال کی روشنی میں تحریک آزادی کشمیر کا مالہٗ وما علیہ پیش کرنا ہے۔ کیونکہ مجھ پر عائد کئے ہوئے الزامات میرے جن اقدامات کا نتیجہ ہیں۔ وہ تحریک آزادی کے سلسلے میں عمل میں لائی ہوئی سعی و کوشش کا ہی ایک جزو ہیں۔ اور ان کو باقی سلسلے سے علیحدہ کر کے دیکھنے سے کوئی صحیح نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

سزا کو لبیک

آپ اس امر کو ابتداء ہی ذہن میں رکھیں کہ مفصل بیان دینے سے میرا مقصد عائد کردہ الزامات کی مروجہ سزا سے بچنے کی کوشش کرنا نہیں۔ کیونکہ جس طرح قانون کی خلاف ورزی کر کے جلسہ منعقد کرنا اور عوام میں نیشنل کانفرنس کے ان مقاصد کی تبلیغ کرنا (جس سے اس ریاست

کا زنگ خوردہ اور فرسودہ نظام حکومت پڑ کتا ہے) میرے ۵ر جولائی کے پروگرام
میں شامل تھا۔ اسی طرح اپنے ان اعمال کے لیئے ہر اس سزا کو جو اس لڑکھڑاتے
ہوئے نظام حکومت کی طرف سے میرے ارادی اقدامات کے لیئے تجویز ہو سکتی ہے لبیک
کہنا بھی اسی پروگرام کا لازمی حصہ ہے۔ لہذا اگر میں اپنے اقدام کی پاداش میں
ملنے والی سزا سے بچنے کی کوئی ہلکی سی کوشش بھی کروں۔ تو وہ اپنے محبوب فرائض
سے بے وفائی ہوگی۔ اور اس کا اثر میرے اس پروگرام پر پڑے گا۔ جس کی تکمیل
میری زندگی کے اولین مقاصد میں سے ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر آپ پر واضح ہوگا۔
تفصیلی بیان کے ذریعہ میں استغاثہ کی بہت زیادہ خدمت کروں گا۔ اور استغاثہ
محدود استعداد کی وجہ سے میرے جن اقدامات اور جن الفاظ تک رسائی حاصل نہیں کر سکا
... وہ پیش کروں گا۔

میرا اصلی گناہ

سب سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میری ملزمیت ۵ر جولائی
سنہ ۱۹۴۷ء سے بہت پہلے کی ہے۔ کشمیر کی تحریک حریت سے بھی یہ
قدیم ہے۔ اور خود میری پیدائش سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے
کہ میری ملزمیت اتنی ہی پرانی ہے جتنی اہل کشمیر کی وہ غلامی اور محکومیت۔ جو نوع
انسان کے تمام گناہوں میں سے عظیم ترین گناہ ہے۔ اتنا بڑا گناہ جو کبھی بھی بخشا نہیں جا
سکتا۔ قرآن مجید میں ہے کہ یوم قیامت یعنے جزا و سزا کے دن خدا تعالیٰ کے سامنے کچھ لوگ ایسے
پیش ہوں گے۔ جن سے ان کے اعمال اور فرائض حیات کی نسبت سوال ہوگا۔ تو وہ اپنی
کمزوریوں اور غفلتوں کے لئے غلامی کی مجبوریوں کو بطور عذر پیش کریں گے۔ اور کہیں گے کہ
كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ (اے خدا ہم زمین پر بود و باش کے دنوں اختیار

واقتدار سے محرومی اور بے چارگی کی مصیبت میں مبتلا تھے، یا الفاظ دیگر جابر طاقتوں کے غلام تھے۔ اس لئے فرائض کی انجام دہی سے قاصر رہے)

ان کا یہ عذر دربار خداوندی میں ناقابل قبول قرار پائے گا۔ اور انہیں عتاب کیا جائے گا۔ کہ "اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا"

(کہ اے پرستارانِ غلامی! تمہارا اولین فرض تو یہ تھا کہ جان کی بازی لگا کر حریت واستقلال کی دلہن سے ہم کنار ہو جاتے۔ اور اگر ایسا کرنے کی جرأت نہ تھی۔ تو خدا کی زمین کیا اتنی تنگ تھی کہ تم غلام آباد کو چھوڑ کر اپنے لئے کسی دوسرے علاقہ میں کوئی آزاد نگری نہ بسا سکے؟)

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کے لئے غلامی کے مقابلہ میں شریفانہ اور آبرومندانہ طرز عمل کے صرف دو راستے ہیں۔

۱۔ غلام بنانے والی طاقت کے ساتھ ٹکر لے کر اسے صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالنا یا اسی جدوجہد میں لمحاتِ حیات بِتا دینا۔

۲۔ غلامی کی سرزمین سے نکلکر آزاد دنیا آباد کرنا اور وہاں سے واپس حملہ آور ہو کر دیو غلامی کو اس کے کیفر کردار تک پہنچانا۔

ایک تیسرا راستہ بھی ہے مگر وہ غیر شریفانہ اور حیوانی راستہ ہے۔ اور وہ ہے غلامی پہ قناعت کا راستہ جو ناقابلِ معافی جرم ہے۔ یہاں اسی دنیا میں اس کی سزا ذلت و خواری ہے۔ اور دوسری دنیا میں ابدی جہنم۔

سو میں آپ کو ابتدا میں ہی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میری ملزمیت حضرت بل کی مو...
۵ رجولائی ۱۹۴۶ء والی تقریر سے نہیں۔ کہ ۱۸۵۷ء سے لیکے کشمیری قوم کی غلامی

اولین دن سے شروع ہوتی ہے۔ اور آپ جو میری "ملزمیت" کی نسبت فیصلہ صادر کرنے بیٹھے ہیں، آپ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ پہلے اس کے طول وعرض کا مکمل جائزہ لیں۔ اس کے بعد فیصلہ صادر کریں۔ اور یہ جائزہ آپ صرف میرے بیان سے ہی لے سکتے ہیں۔ اس لئے امید ہے کہ آپ میرے بیان کی طوالت کے لئے مجھے معذور سمجھیں گے۔

اقدام کا مقصد

ہو سکتا ہے کہ ماضی بعید کے واقعات کی طرف اشارہ سینکڑوں برسوں کے پرانے واقعات سے اخذ کردہ نتائج کشمیریوں کے زوال کی دردناک کہانی، متغلب حکومتوں کے وحشیانہ کارناموں کی پردہ داری، کشمیر میں نئی بیداری کے اسباب وعلل اور تحریکِ حریت کشمیر کے نشیب وفراز وغیرہ امور آپ کے لئے غیر دلچسپ اور خشک مضمون کی حیثیت رکھتے ہوں لیکن آپ اُن کو میری ملزمیت سے غیر متعلق نہیں پائیں گے۔ اور ان پر عبور کے بعد آپ یہ سمجھنے پر قادر ہو جائیں گے کہ حضرت بل کے مجمع سے خطاب سے میری مراد کیا تھی۔ اور نیشنل کانفرنس کے جن سینکڑوں کارکنوں کو آپ اور آپ کے ساتھی جج پچھلے پانچ ماہ سے دو لفظی اقرار و تسلیم کے بعد سزائیں دے رہے ہیں۔ انہیں ایثار وقربانی کا یہ راستہ اختیار کرنے پر جن جذبات نے مجبور کر رکھا ہے۔ ان کا اصلی منبع کہاں ہے۔

غلامی کے ۳۶۰ سال

جیسا کہ میں نے ابھی اشارہ کیا کہ اہل کشمیر کی موجودہ دُرگت صرف پچھلے سو سال کا ہی نتیجہ نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ڈوگرہ راج کے سو سال کے دوران میں اس ریاست کے باشندوں نے تنزل کی بڑی منزلیں طے کیں۔ لیکن کشمیر کے تنزل اور غلامی کی ابتدا ۱۸۴۶ء سے دو سو ساٹھ سال قبل ۱۵۸۶ء میں اس وقت ہوئی جب کشمیر اپنی آزادی اور خود مختاری کی دولت

سے محروم ہوکر مغل امپریلزم کے پنجہ میں گرفتار ہوگیا۔ یہی غلامی تھی جو مغل تسلط کے وقت جڑھ پکڑ کر افغانوں کے دور میں انتہا کو پہنچی۔ اور اس کے بعد جب سکھوں کا زمانہ آیا۔ تو کشمیری عوام انسانیت کے درجے سے گرا کر حیوانوں میں شامل کر دئے گئے۔ ڈوگرہ دور کے بانی مہاراجہ گلاب سنگھ کو ۱۸۴۶ء میں جو کشمیر ۷۵ لاکھ روپے کے عوض میں ملا۔ اس کے باشندے غلامی اور بے چارگی کے انہیں تین دوروں کی کچلی ہوئی لاشیں تھے۔ ان کے لئے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی خرید فروخت کا صحیح معنوں میں احساس تک کر سکتے چہ جائیکہ اس خرید و فروخت کے خلاف مزاحمت یا کم از کم احتجاج کے ہی فرائض انجام دیتے۔ ان کی بے بسی، بے چارگی اور دماغی پستی ہو بہو ان بے زبان بھیڑوں کی سی تھی جنہیں سوداگر کہیں سے خرید لائے۔ اور ایک قصاب پر بیچ ڈالے۔

ابتدا و انتہا کا تقابل

ہر ایک پیداوار پر اس کے ماحول کی قدرتی مہر ثبت ہوتی ہے اور کشمیر کی موجودہ آبادی اپنی ذہنی، جسمانی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی ساخت کے لحاظ سے جو کچھ بھی ہے وہ پچھلے ان چار حکومتی دوروں (مغل راج، افغان راج، سکھ راج، ڈوگرہ راج) کے ماحول کی پیداوار ہے۔ اور اس پر بھی اس ماحول کی مہر ثبت ہے۔ موجودہ کشمیر کا آج سے ۴۰۰ سال قبل کے خود مختار کشمیر کے ساتھ توازن کرنے کے لئے صرف یہ ایک تاریخی واقعہ سامنے رکھنا کافی ہوگا۔ کہ ۱۵۸۵ء میں اکبر اعظم نے پہلی بار کشمیر پر جب پکھلی اور مظفر آباد کے راستہ حملہ کیا۔ تو کشمیری پادشاہ کے بیٹے یعقوب چک کی قیادت میں کشمیریوں نے اپنے وطن کی حفاظت میں بہادری کے بے نظیر کارنامے دکھائے۔ اور بارہ مولہ کے پاس مٹھی بھر کشمیری فوج نے مغل لشکر کے ہزارہا سپاہیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اور مغل جرنیل سرحدی قوانین اور

قبائل کی امداد کے باوجود ذلت آمیز شکست برداشت کر کے ہندوستان کی طرف بھاگ گئے۔ مگر آج ہمارے اعمال نے یہ وہم پھیلا دیا ہے۔ کہ سپاہی اور کشمیری دو متضاد چیزوں کے نام ہیں ؎

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
خاک ہیں آج انتہا یہ ہے

۱۵۸۷ء ۹۹۵ ہجری

اس شکست کا انتقام لینے کے لئے شہنشاہ اکبر اور اس کے درباری مدبر پندرہ سال تک خفیہ چالیں چلتے رہے۔ ۱۵۸۷ء میں آخر کار کشمیر کے آخری بادشاہ یوسف چک کی عشرت پسندی۔ کشمیری جرنیلوں کی ذاتی رقابتیں اور کشمیری عوام کے فروعی اختلافات (جن کا سلسلہ بد قسمتی سے چکوں کے برسر اقتدار آنے کے وقت سے ہی جاری تھا) مغل حکومت کے لئے کامیابی کا ذریعہ ثابت ہوئے اور کشمیر نے مغل تاج کے ہیروں میں شامل ہو کر اکبر اعظم کی دیرینہ آرزو پوری کر دی۔ مگر اس کے باوجود جب تک خود کشمیری اکابر نے وفد کی صورت میں مغل دربار میں حاضر ہو کر "بلا را در دیارِ خود صلا داد" کے مطابق اکبر کو کشمیر پر چڑھائی کی دعوت نہ دی مغل فوجوں کے قدم بھمبر اور راجوری سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس طرح کشمیری خود غلامی کے اس کنوئیں میں کود پڑے جس سے ابھی تک نکل نہیں سکے ؎

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

سیاسی تپ دق

مغلوں کے طویل تسلط کے تحت کشمیریوں کی وہی حالت رہی۔ جو دق کے مریض کی ابتدائی حالت ہوتی ہے۔ بظاہر وہ چاق و چوبند بنا پھرتا اور رکھتا دیکھتا نظر آتا ہے لیکن مرض کے مہلک جراثیم اندر ہی اندر اس کے جسم

کو کھوکھلا بنا رہے ہوتے ہیں. مغل حکومت بھی کشمیریوں کے ساتھ بظاہر بڑا نرم سلوک کرتی رہی. قحطوں اور سیلابوں کے موقعوں پر مغل بادشاہ بڑی دریا دلی سے عوام کی امداد کرتے اور اپنی "غریب پروری"، "رعایا نوازی" اور "منصف مزاجی" کا خوب ثبوت دیتے. لیکن جو باتیں کشمیریوں کو بحیثیت قوم زندہ رکھ سکتی تھیں۔ اس دور میں ان سے کشمیر کے باشندوں کو پورے طور پر دور رکھا گیا. یوسف چک کا بیٹا یعقوب چک جو کشمیر سے بھاگ کر کشتواڑ میں چھپا ہوا تھا. اور کبھی کبھار ڈوڈون کا درہ عبور کر کے جنوبی کشمیر پر ناکام حملے بھی کر جاتا تھا. مغل حکومت نے اس کا اور اس کے رازداروں کا قلع قمع کرنا ایک بہانہ بنا لیا. اور اس بہانے کی آڑ میں کشمیر کے ہر ایک سربرآوردہ فوجی سردار کو کچلنے کا سلسلہ اکبری فتح سے لیکر جہانگیر کے آخری ایام تک مسلسل جاری رہا. اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر کے ہر شریف شخص کو اپنی خیریت اسی میں نظر آئی کہ وہ اپنے آپ کو فوجی دلچسپیوں اور بہادرانہ اور وطن پرورانہ خیالات سے بے بہرہ ثابت کرے. تاکہ پرانی کشمیری حکومت کی طرفداری اور مغل شہنشاہیت سے بے وفائی اور نفرت کے الزام میں اس کی خانہ ویرانی نہ کی جائے. اس طرزِ عمل کے ساتھ ساتھ مغلوں نے اور ان کے صوبہ داروں نے اپنی یہ طے شدہ پالیسی رکھی کہ کشمیریوں کو کشمیر کے انتظامی عہدوں کے قریب بھی نہ بھٹکنے دیا جائے. اور فوج میں آفیسر تو کجا کوئی کشمیری سپاہی بھی نہ رکھا جائے. اسی طرزِ عمل کا یہ نتیجہ تھا. کہ کشمیر پر مغلیہ دور کے ۱۶۵ سال ختم ہونے کے ساتھ ساتھ کشمیریوں کے دماغ سے خودمختاری، خود اعتمادی بلکہ خودداری تک محو ہو چکی تھی. اور انہوں نے مغل دور کے خاتمہ پر ۱۷۵۱ء میں افغان حکومت کو اسی خاموشی سے قبول کر لیا. جس خاموشی سے کوئی باربردار جانور پہلے بوجھ کے بدلے دوسرے بوجھ کو قبول کر لیتا ہے. یہ ذہنی

پستی حد درجہ افسوسناک ہے مگر حیرت ناک نہیں۔ کیونکہ غلامی انسان کے جسم سے پہلے اس کے دماغ پر حملہ آور ہوتی ہے۔ اور نیک و بد کے اس معیار کو زیر و زبر کر دیتی ہے جس کی روشنی جادہ حریت کی اولین رہنما ہے ؎

جو تھا ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتے ہیں قوموں کے ضمیر

وحشت و بربریت

۱۷۵۲ء سے قریباً ستہتر سال تک وادیٔ کشمیر میں افغانوں کے جبر اور کشمیریوں کے صبر کے درمیان مقابلہ ہوتا رہا۔ اس دور میں بے قانونی اور لوٹ مار اپنی انتہا کو پہنچ گئے۔ افغانی دور کی یہ خصوصیت تھی کہ درہ خیبر کے اس پار رہنے والا جو شخص بھی بارہ مولہ سے ادھر قدم رکھنے میں کامیاب ہو جاتا۔ وہ اپنے آپ کو تیمور شاہ اور زمان شاہ درانی بلکہ ان کے جدامجد احمد شاہ ابدالی سے کم نہ سمجھتا۔ اور باشندگان کشمیر کے جان و مال اور گھر بار کا اپنے آپ کو جائز مالک یقین کر لیتا۔ ان افغانوں کی نظر کشمیریوں کی جس اچھی چیز پر پڑ جاتی۔ وہ ان کے ہاتھ سے بچ نہ سکتی تھی حتیٰ کہ لوگوں کی بہنیں اور بیٹیاں بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ رہیں! خوددار اور زندہ قوموں کو ایسے موقعوں پر آزادی کا جذبہ سبق دیتا ہے کہ اپنے آپ پر اعتماد کر کے بغاوت کریں۔ اور انقلاب برپا کر کے ظالم کے پنجے سے نجات حاصل کر لیں۔ لیکن مغلوں کے تپ دق نے کشمیریوں کے اعضا میں اتنی سکت باقی نہ چھوڑی تھی کہ وہ درانی افغانوں کو کشمیر سے نکال کر اپنے گھر کے آپ مالک بننے کی تجویز سوچتے۔ چنانچہ اہل کشمیر حکومتِ کابل کے درندہ صفت حکام کے ہاتھوں جان بلب ہو جانے کے باوجود ان کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرنے کے مقدس فرض کو ادا نہ کر سکے۔ اور

وحشت انگیز غلامی کا گلو فشار پھندا ان کے گلے کا موروثی ہار بن گیا۔

بیوہ نے خاوند تلاش کیا!

غلامانہ پست ہمتی کے باعث آزادی اور خود مختاری کے تصور تک بھی اب اہل کشمیر کی رسائی باقی نہ رہی تھی۔

غلامی کو "تقدیر کا نوشتہ" یقین کر لینے کے بعد صرف "بُرے آقا" کے بدلے "اچھا آقا" ان کا قبلہ مقصود بن گیا تھا۔ افغانوں سے بیزار ہو کر انہوں نے ۱۸۱۹ء میں نئے خاوند کی متلاشی بیوہ کی طرح چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اور آخر کار لاہور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کو اپنے دکھ کی دوا سمجھ کر چند معززین ورؤسائے کشمیر "دست بستہ" اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کو کشمیر پر چڑھائی کی دعوت دی۔ جب صورت یہ تھی کہ صید خود صیاد را گو بیا بگیر" تو مہاراجہ رنجیت سنگھ کو کشمیر پر چڑھائی کرنے اور دنیا کی جنت پر ایسا سستا قبضہ کر لینے میں کیا عذر ہو سکتا تھا۔ وہ تو مدت سے افغانوں کو کابل تک پیچھے دھکیل دینے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ مگر جب تک کشمیر افغانوں کے قبضہ میں تھا۔ ان کی پوزیشن مستحکم تھی۔ اب کشمیر سے باہر نکالنے کے لیے باشندگان کشمیر کا مکمل تعاون اس کی منہ مانگی مراد تھی۔ جو پوری ہو گئی۔ اور کشمیری دھوپ سے بھاگ کر آگ کی بھٹی میں آگرے۔

سکھا شاہی کی چکی

آزادی اور خود مختاری کا یہ دوسرا سنہری موقعہ تھا۔ جو کشمیریوں نے مفت میں ہاتھ سے دیکر ایک قومی اور اجتماعی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔ ہمیشہ سے ہر ایک گناہ کی سزا اس کے ساتھ وابستہ رہی ہے۔ اور غلامی قبول کرنے کا گناہ تو اتنا بڑا گناہ ہے۔ کہ گناہ اور سزا ایک ساتھ ہی شروع ہوتے ہیں کشمیری بھی جس نئی غلامی کو لاہور سے "خرید" لائے تھے۔ اب اس کی سزا بھگتنے لگے۔ اور اپنے کیے کا ایسا مزہ چکھا کہ آج تک جبکہ وہ ماضی کی تمام تلخیاں بھول چکے ہیں۔ تا ایں دم

سالہ خالصہ دور میں لکھے ہوئے عذاب کی کڑواہٹ اب بھی محسوس کر رہے ہیں۔ اور اس "سکھاشاہی" کو بھول نہیں سکے جس کا ادنیٰ سا نمونہ یہ تھا کہ اگر کوئی کشمیری کسی سکھ سورمے کے جوتوں اور ڈنڈوں کی تاب نہ لاکر مرجاتا۔ تو خالصہ جی مبلغ چھ روپیہ نانک شاہی خزانہ سرکار میں داخل کر کے قتل کے جرم سے بری الذمہ قرار پا جاتے۔ البتہ اگر مرنے والا کشمیری ہندو ہوتا۔ تو مزید دو روپے مقتول کے وارثوں کو دینے پڑتے۔ (یہ رعایت شاید اسی لئے تھی۔ کہ سکھوں کو کشمیر پر چڑھائی کی دعوت دینے میں کشمیری پنڈت پیش پیش تھے) یہ دورِ وحشت اور بربریت کا ایک طوفان تھا جس کی امواج کے تھپیڑے ستائیس ۲۷ سال تک کشمیری قوم کے انہدام میں مصروف رہے۔

بغاوت کیوں نہ کی؟ آج ہر شخص کو حیرت ہوتی ہے کہ ۱۸۱۹ء سے ۱۸۴۶ء تک سکھ راج کے ہاتھوں اتنی ذلت اور خواری برداشت کرنے کے باوجود کشمیر کے لوگوں نے لاہور دربار کے خلاف بغاوت کیوں نہ کی لیکن اوپر کی سطروں میں ان کی غلامانہ زندگی کے نشیب و فراز کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کا جائزہ لینے کے بعد یہ جان لینا کوئی مشکل نہیں کہ اس وقت کشمیریوں کا قومی شیرازہ بری طرح سے تتر بتر ہو چکا تھا۔ اہل کشمیر کے بغاوت کی ہمت رکھنے والے دل و دماغ جابر اور غاصب حکومتوں کے ہاتھوں مٹی میں ملا دئے گئے تھے۔ دوسرے درجے کے خوددار افراد ظلم کی تاب نہ لاکر کشمیر کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ اور پیچھے ملک میں وہی کچلا ہوا عنصر باقی رہ گیا تھا۔ جس کی ذہنی اور عملی قوتیں بغاوت ایسے پاک اور اونچے نصب العین کا تصور نہیں کر سکتی تھیں۔

ان حالات میں یہ تو ہو سکتا تھا کہ اس وقت کے غلامی پرست کشمیری سکھوں

کے راج سے بیزار ہو کر کسی نئے آقا کی تلاش میں گھر سے نکلتے۔ لیکن انہیں اپنی کامیابی کی کوئی عملی صورت نظر نہ آئی ہوگی۔ کیونکہ اس وقت تین طرف سے کشمیر خالصہ حکومت کے مقبوضہ علاقوں سے گھرا ہوا تھا۔ اور چوتھی طرف ان کے غلامانہ آرزوؤں کے درمیان قراقرم کی اونچی چوٹیاں حائل تھیں۔ ورنہ وہ آقا کی تلاش میں یارقند تک جانے سے بھی دریغ نہ کرتے

۱۸۴۶ء کا منحوس سال

لیکن اُن کی یہ مراد جو کہ آقا کی تبدیلی تک ہی محدود تھی۔ اور اپنے گھر کا آپ مالک بننے کی پاک تمنا سے خالی تھی۔ ان کی کوششوں کے بغیر ہی یوں پوری ہو گئی۔ کہ ۱۸۴۶ء میں خالصہ حکومت انگریزوں کے ساتھ لڑائی ہار جانے کی وجہ سے اپنے مقبوضات کا ایک بڑا حصہ کھو بیٹھنے کے علاوہ تاوان جنگ ادا کرنے پر مجبور ہو گئی۔ لاہور کا خزانہ پہلے ہی خالی ہو چکا تھا۔ اس لئے انگریزوں نے اس کو علاقے بیچنے پر مجبور کیا۔ قاعدہ ہے کہ جب کوئی مقروض شخص اپنی جائیداد فروخت کرنے پر مجبور ہو جائے۔ تو خریدار اس کی بہترین جائیداد کو ہی چنتے ہیں۔ خالصہ حکومت کے علاقوں میں کشمیر سے بہتر کون علاقہ ہو سکتا تھا۔ جو خریداروں کی دلکشی کا مرکز ہو سکتا۔

نیلامی کا مال

لاہور کی خالصہ حکومت کی پوزیشن اس موقعہ پر ہو بہو ایک مجبور دیوالیئے کی سی تھی۔ جو اپنے قرض خواہ سے کہہ دیتا ہے۔ کہ "صاحب قرض چکانے کو میری تجوری میں کھوٹا پیسہ بھی موجود نہیں۔ میں اس کی ادائیگی سے منکر نہیں ہوں۔ لہذا یہ ہے میری زمین، وہ ہے میرا باغ، یہ ہے کنواں، اور وہ ہے چشمہ، اتنے گائے، بیل اور اتنی بھیڑ بکریاں سب آپ کے سامنے ہیں۔ انہیں اونے پونے داموں فروخت کر کے اپنا قرضہ چکا لیجئے۔ اور مجھے بے باقی کی رسید لکھ دیجئے۔" تاوان جنگ کے مطالبہ کے جواب میں خالصہ حکومت نے بھی یہی کیا اور اپنا وہ تمام علاقہ جو دریائے راوی کے

مغرب میں دریائے سندھ (نیلاب) کے مشرق میں اور پنجاب کے میدانی علاقوں سے شمال کی طرف واقع تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندوں کے سامنے رکھ دیا۔ مگر انگریز کو اسوقت نقد روپیہ کی سخت ضرورت تھی۔ اس نے مقروض سے حاصل کردہ یہ جائیداد غیر منقولہ" بولی پر چڑھا دی۔ اتنی عظیم جائیداد کو ہر شخص خریدنے کی ہمت نہ کرسکتا تھا۔ ایک پیشگی مگر خفیہ سمجھوتہ کے مطابق اس جائداد کے سابق مالک کا ہی پروردہ اور معتبر کارپرداز میاں گلاب سنگھ سامنے آیا۔ اور خصوصی خدمات کے علاوہ پچھتر لاکھ روپیہ نقد دیکر اور آئندہ کیلئے اپنے وطن اور قوم کو انگریز کا غلام رکھنے میں امداد کا وعدہ کرکے اس جائیداد پر قبضہ حاصل کرلیا۔ یوں تو زمانہ قدیم سے سہ

سکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرت انسان کی قبا چاک

لیکن اہلِ کشمیر کی قبا ۱۸۴۶ء میں جب انگریز اور ڈوگرے کے ہاتھوں چاک ہوئی۔ تو اس کا انداز بالکل نرالا تھا۔ یعنی کشمیر کی فتح اور اس پر قبضے کا ذریعہ بہادرانہ تیر و تلوار نہیں۔ بلکہ بنیا کے درہم و دینار تھے۔

"قوم ے فروختند"

اس طرح وادی کشمیر اور راوی سے لیکر دریائے سندھ تک کشمیر کے ملحق پہاڑی علاقے بمعہ اپنی زمین، سر بفلک پہاڑوں، ہرے بھرے جنگلات سونا بکھیرنے والے دریاؤں، بل کھاتی ہوئی نغمہ ریز ندیوں، صاف و شفاف چمکیلی جھیلوں خوش ذائقہ اور زندگی بخش چشموں، لہلہاتے ہوئے زرخیز کھیتوں، اور جنت کے میووں سے لدے پھندے باغات پچھتر لاکھ نانک شاہی روپوں کی حقیر رقم میں بک گئے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس سرزمین کے زیرک و ذہین، خوش سیرت اور خوش صورت مگر غلامی کی بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے لاکھوں انسانوں کو ان کے گھر و بار، مال مویشی اور متاع و اسباب

سمیت انگریزوں نے اِس ہاتھ سے سکھ حکومت سے لیا۔ اور اُس ہاتھ سے میاں گلاب سنگھ پر فروخت کر ڈالا ؎

فلک نے لوٹ کے لٹوا دیا حسینوں سے
سمجھ لیا کسی مُردے کا اس نے مال مجھے

یہ ابتدا تھی اس تباہی و بربادی کی جس کی انتہا آج کشمیر میں چاروں طرف یہ منظر دکھا رہی ہے کہ ؎

جان بھی گروِ غیر بدن بھی گروِ غیر | افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
دہقان ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ | بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمین ہے

"چہ ارزاں فروختند" اس خرید و فروخت نے کرۂ ارض کے سب سے زیادہ خوبصورت خطۂ کشمیر اور اس کے ملحقات کو "بہشت بر روئے زمین" کے درجے سے گرا کر متاعِ تجارت کا درجہ دیدیا۔ اور اس کے باشندے دست بدست بکنے والے غلاموں سے بدتر ہو گئے۔ اور حیوانوں سے بھی گئی گزری اور ذلیل زندگی بسر کرنے پر مجبور کر لئے گئے۔ تاریخ میں کشمیر کے لئے اس خرید و فروخت سے بڑھ کر اجتماعی "تذلیل، تحقیر، توہین و تباہی کا کوئی واقعہ نہ گذرا تھا جس نے انہیں عزت و آبرو، اپنی محنت کے نتائج اور انسانی فضائل سے بھی محروم کر دیا۔ اور اس واقعہ پر اسّی سال گذر جانے پر جب ایک بڑے کشمیری حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ اس طرف گئی۔ تو وہ آبدیدہ ہو کر چلا اٹھے کہ ؎

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی | حرفے ز ما بہ مجلسِ اقوام باز گو
دہقان و کشت و جوئے و خیاباں فروختند
قومے فروختند چہ ارزاں فروختند

سرحد، پنجاب اور کشمیر

کشمیر ذہنی اعتبار سے اپنے ہمسائے علاقوں پنجاب اور سرحد سے ۱۳۴۶ء سے بھی پہلے پیچھے رہ چکا تھا۔ جس کے اسباب یہ تھے کہ بابری حملہ کے وقت سے سرحد اور پنجاب نے مغلوں کی آمد کو نہ صرف لبیک کہا تھا۔ بلکہ وہ بابر اور ہمایوں کے دست و بازو بن کر باقی ہندوستان میں مغل سلطنت کا استحکام کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اور کشمیر ان مواقع پر غیر جانبدار اور کنارہ کش رہا۔ اور جب ۱۵۳۹ء میں شیر شاہ کے عروج کی تاب نہ لا کر شہنشاہ ہمایوں چاہتا تھا کہ کشمیر میں آ جائے۔ اور کشمیریوں کی امداد سے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت واپس حاصل کرے۔ مگر کشمیری حکومت نے اسے کوئی امداد نہ دی۔ اور اسے مجبوراً گجرات سے واپس ہو کر سندھ اور قندھار کے راستے ایران کا رخ کرنا پڑا۔ مغل شہنشاہیت کی یہ بے ادبی ہی قابل معافی نہ تھی۔ مگر کشمیریوں کے جرائم یہیں تک ختم نہ ہوئے بلکہ ۱۵۸۵ء میں جب جلال الدین اکبر اعظم کے سامنے کابل، قندھار بیجاپور، لکھنوتی (بنگالہ) بہار وغیرہ ایک ایک کر کے سربسجود ہو چکے تھے۔ کشمیر کی طرف سے اس کی فوجیں شکست کے تحفے دے کر لوٹائی جاتی تھیں۔ یہ تھی کشمیر کی اولین تصویر جو مغل نے دیکھی۔ ان تعلقات کے بعد جب مغلوں نے کشمیر کو فوجی مہم سے زیادہ ڈپلومیسی کی طاقت سے فتح کر لیا۔ تو قدرتی بات تھی کہ ان کا سلوک سرحد اور پنجاب کے ساتھ فیاضانہ اور کشمیر کے ساتھ محض فاتحانہ ہو۔ اس طرح آئندہ دور میں کشمیر کا ان صوبوں کی سیاسی اور ذہنی سطح سے پست رہ جانا قدرتی تھا۔ افغان دور میں سرحد کو ہمزبانی اور ہم جنسیت کا سہارا مل گیا۔ اور پنجاب کا مشرقی حصہ مغل اقتدار کے تحت ذلت سے بچا رہا۔ اور مغربی پنجاب میں زرخیزی نہ تھی۔ جو ایک وحشی حکومت کو عوامی غارتگری کی دعوت دیتی۔ مگر کشمیر کی خوبیاں اس کے لئے مصائب کا موجب بنی رہیں۔ اور جب خالصہ دور آیا۔ تو سکھوں کے لئے پنجاب اپنا وطن تھا۔ اور

سرحد فولادی چنا تھا۔ اس لئے اس حکومت کے کارپرداز بھی صرف کشمیر سے اپنی خونخواری کی پیاس بجھاتے رہے۔ اور ان کے تشدد کی ساری طاقت اسی پر صرف ہوتی رہی۔ ان تمام واقعات نے سرحد اور پنجاب سے کشمیر کو سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے اتنا ہی پیچھے ہٹا دیا۔ جتنا وہ مغل قبضہ کے وقت (۱۵۸۶ء میں) ان ہمسایہ صوبوں سے آگے تھا۔

ذلت کی انتہا

اب ۱۸۴۶ء میں جب ڈوگرہ خاندان کے بانی نے کچھ قوم فروشانہ خدمات اور کچھ نقد روپیہ دے کر کشمیر کو خرید ا۔ تو کشمیری بحیثیت قوم کے ذلیل غلام تھے۔ جن کا نہ کوئی ماضی تھا۔ نہ تاریخی ہستی۔ گویا یہاں نہ کوئی للتادتیہ ہو گذرا تھا۔ نہ کوئی شہاب الدین اور نہ کوئی زین العابدین۔ جن کی عظمت کو کشمیری اپنی اولوالعزمی کا معیار بنا سکیں۔ ظالم آقاؤں نے ان کی ہر خوبی کو نہ صرف مٹا ڈالا تھا۔ بلکہ اس کے امکان سے بھی انکار کر دیا تھا۔ مدت سے وہ کشمیری انسان میں کسی انسانی فضیلت کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ اور تحقیر کے طور پر انہوں نے مکاری، جھوٹ، فریب اور بے غیرتی و بے حمیتی کو اہل کشمیر کی خصوصیات میں شامل قرار دے دیا تھا۔ اور ایک ایسا انفسیاتی پست ماحول پیدا کر دیا تھا۔ جس میں خودی، خودشناسی اور خوداعتمادی کے لئے کوئی جگہ باقی نہ تھی۔ جن لوگوں کو تہذیب و تمدن کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ وہ اب کشمیریوں ایسی معلم تہذیب قوم کا مضحکہ اڑا رہے تھے ؎

زاغ کہتا ہے نہایت بدنما ہیں تیرے پر ✽ شپرک کہتی ہے تجھ کو کور چشم و بے ہنر
لیکن اے شہباز! یہ مرغانِ صحرا کے اچھوت ✽ ہیں فضائے نیلگوں کے پیچ و خم سے بے خبر

ڈوگرہ سے ہی ٹکر کیوں؟

ہر صورت یہ مسلمہ ہے کہ کشمیر کی بربادی انیسویں صدی کے نصف سے شروع ہونے والے اکیلے ڈوگرہ راج کی

تباہ کاریوں کا ہی نتیجہ نہیں۔ اس بربادی کی ذمہ داری مغل دور، افغان دور اور سکھ دور پر بھی بحصہ مساوی عائد ہوتی ہے۔ جو سولہویں صدی کے آخری برسوں سے لیکر پوری ستارھویں اور اٹھارویں صدی اور انیسویں کے ابتدائی چھیالیس سال تک اس باغ کو اجاڑنے میں مصروف رہے۔ اس کے باوجود تحریک آزادی سے تعلق رکھنے والی تقریروں اور تحریروں میں اگر ہم صرف ۱۸۴۶ء کے بیعنامہ امرتسر اور اس کے بعد کے واقعات پر ہی بحث کرتے ہیں۔ تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ کشمیر کی تباہی کے ذمہ دار سابق تینوں دور ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ بلکہ اس کا سبب محض یہ ہے کہ پہلے تینوں دور کشمیر کو تباہ کرنے کے بعد خود بھی تباہ ہو کر ماضی کے بے کنار سمندر میں وہاں غرق ہو چکے ہیں جہاں کسی غوطہ خور کی دسترس نہیں۔ اور اب وہ کشمیر کی ترقی اور آزادی کے راستے میں مزاحم بن کر حائل نہیں ہو سکتے۔ لیکن آخری دور جو ۱۸۴۶ء سے شروع ہوا۔ وہ ابھی تک ایک پہاڑ کی طرح کشمیر کی آزادی کا راستہ روکے ہوئے کھڑا ہے۔ پچھلی تباہیوں کی تلافی کے لئے آج کشمیری اگر کوئی کوشش کرتے ہیں۔ تو اس کو ناکام بنانے کے لئے بیعنامہ امرتسر اور اس کی بنا پر قائم شدہ ڈوگرہ نظام سامنے آجاتا ہے۔ اور اپنی پیدا کردہ تمام تباہ خیزیوں کے ساتھ تحریک حریت کے بالمقابل صف آرا ہو جاتا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر عملی جدوجہد کے وقت اسی آخری دور سے ٹکر لی جا سکتی ہے۔ اور بحث کے وقت اسی کو خطاب کیا جا سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آج تک چاروں دوروں کی پھیلائی ہوئی تباہ کاریوں سے کشمیریوں کی نجات اب صرف اسی آخری نظام کے خاتمہ پر منحصر ہے۔ جو ان پہلے تینوں کا جانشین اور ان کی تمام برائیوں کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ اور جن برائیوں کا خود بانی مبانی ہے۔ وہ اس کے علاوہ ہیں۔

ڈوگرہ راج کے عناصر ثلاثہ

دنیا کے مختلف ممالک میں جو سسٹم عوام کی اجتماعی بربادی کے سبب مانے گئے ہیں۔ ان میں جاگیر داری، سود خواری، اور راشیانہ لوٹ کھسوٹ کو پہلا درجہ حاصل ہے۔ کسی ملک میں ان خرابیوں میں سے ایک خرابی بھی اگر عروج حاصل کرے۔ تو اس ملک کی تباہی میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

کشمیر میں ۱۸۴۶ء سے ۱۹۴۶ء تک تین سو سال ختم ہوئے ہیں۔ ان میں جاگیرداری سود خواری اور راشیانہ لوٹ کھسوٹ تینوں کو پورا فروغ حاصل رہا۔ یہ تینوں سسٹم ایک دوسرے کے تعاون اور امداد سے ملک کو اجاڑنے میں مصروف رہے۔ اور ڈوگرہ نظام حکومت ان کی سرپرستی اور آبیاری کا فرض انجام دیتا رہا۔ اور خود بھی انہیں کے سہارے زندہ رہا۔

ہلاکت آفریں دور

نظام حکومت جس کی بنیاد خرید و فروخت اور لین دین پر رکھی گئی تھی۔ در اصل اپنی فطرت کے لحاظ سے ایسا ہی واقع ہوا تھا۔ کہ اس کے سائے میں جاگیرداری، چک داری اور غیر حاضر زمینداروں کی کاغذی مالکیت ایسی وحشیانہ برائیاں پھولیں اور پھلیں۔ نفع، بیاج، "ود" "ٹ" "کیہ" اور سود خواری کی دوسری انسانیت کش شکلیں کشمیر کے ہر ایک شہری اور دیہاتی کو اپنے پنجے میں لے لیں۔ اور حکومت کے چھوٹے بڑے کارندے کنبہ پروری، رشوت خوری اور استحصال بالجبر کو اپنے منصبی فرائض میں شامل کر لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور جاگیرداری، سود خواری اور رشوت خواری نے اس سو سالہ دور کے دوران میں عوامی زندگی کے ہر شعبے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور یہ ناممکن ہو گیا کہ جموں و کشمیر کا کوئی باشندہ ان سہ گونہ ہلاکت آفریں مصائب کی زہریلی فضا سے باہر ہو کر سانس لے سکے۔

جاگیرداری

یوں تو ۱۸۴۶ء سے پہلے بھی اس ریاست کی حدود میں جاگیرداری

موجود تھی۔ لیکن بیعنامہ امرتسر نے اس کو اور بھی وسیع اور مستحکم کر دیا۔ بیعنامہ کی رُو سے حکمران کو جو نامحدود اختیارات حاصل ہوئے۔ ان کی بنا پر اس نے یہ قرار دیا کہ میں اس زمین کے چپے چپے کا مالک ہوں۔ گویا وہ خود سب سے بڑا جاگیردار بن بیٹھا! اب اس کے مفاد اور باقی جاگیرداروں، ٹھیکداروں اور غیر حاضر مالکوں کے مفاد ایک ہو گئے ایسا حکمران جو خود استحصالی فرقے کا ایک فرد بن جائے۔ اس کے لئے کب ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ عوام اور جاگیرداروں کے درمیان مفاد کی کشمکش میں انصاف کا ساتھ دے سکے۔ اس کا نتیجہ یہی ہوا کہ جموں و کشمیر میں جاگیرداری بغیر کسی روک ٹوک کے عوام کی گردن پر اپنی گرفت کو مضبوط کرتی گئی۔ جاگیرداری کو سرکاری سرپرستی کے ساتھ ساتھ مزید پھیلایا بھی گیا۔ ڈوگرہ راج سے پہلے اکثر جاگیریں قائم رکھنے کے علاوہ ملک کو نئی نئی جاگیروں میں تقسیم کرنے کا سلسلہ پورے ایک سو سال تک جاری رہا۔ ایک مخصوص پالیسی کے تحت وادی کشمیر کو جاگیروں میں بدل دینے کی مہم برابر جاری رہی۔ کسی ڈوگرہ سپاہی نے کوئی ذرہ سی امتیازی خدمت انجام دی۔ تو جھٹ اسے کشمیر کا کوئی نہ کوئی گاؤں بخش دیا گیا۔ اور فوج سے پنشن پانے والے منظور نظر افسروں کو تو علاقوں کے علاقے عطا کئے گئے۔ ابتدائی دور کے دیوانوں اور وزیروں کو بھی جاگیروں پر جاگیریں ملتی رہیں اور یہ ہمیشہ کشمیر کے صوبہ میں ہی دی گئیں۔ اور ۱۹۲۵ء کے بعد نئے مہاراجہ کی تخت نشینی کے بعد بھی ڈوگروں کو دختر کشی سے باز رہنے پر بھی کشمیر میں جاگیریں ملیں۔ اور بہت سے جموی جاگیرداروں کو جموں میں، جاگیر سے دست بردار کرا کے کشمیر میں اس سے دوگنا جاگیریں عنایت ہوئیں۔ آج بارہمولہ، ہندوارہ، بڈگام، پلوامہ، کولگام وغیرہ تحصیلات میں جو ہر طرف جاگیریں ہی جاگیریں نظر آتی ہیں۔ اور سنی وارہ علاقہ کے چکوک نیز گاندربل وانگت اور وٹنرا اور ڈل کے آس پاس پھیلی ہوئی نئی جاگیریں۔ یہ سب اسی پالیسی کا نتیجہ ہیں کہ کشمیر جاگیرات اور چکوک کے مجموعے کا دوسرا نام ہونا چاہیئے۔ ان قدیم و جدید

جاگیرات میں ظلم وستم کا جو دور دورہ رہتا ہے۔ وہ پونچھ اور چنینی ایسی بڑی جاگیروں سے لیکر کلنگام کی چھوٹی جاگیروں تک ہر جگہ عوام کی زندگی کو جہنم بنا رہا ہے۔

سود خواری

ریاست جموں وکشمیر جیسا علاقہ جو اپنی پسماندگی اور ذرائع نقل وحمل کے فقدان کی وجہ سے بڑے پیمانہ پر صنعتی ترقی اور مشترکہ اجتماعی تجارت کی سہولتوں سے محروم تھا۔ اس میں پرانے طریقے کی یہودیانہ سود خواری کو فروغ حاصل ہونا تعجب انگیز نہیں۔ تجارت کے ترقی یافتہ پاکیزہ راستوں کو بند دیکھ کر پیسے والے ہر شخص کا دماغ اسی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ وہ ماحول کی احتیاج سے ایک کو ایک سو" بنانے میں مصروف رہے۔ سود خواروں کی لالچ سے لوگوں کو امتناعی اور حفاظتی قوانین ہی بچا سکتے ہیں۔ مگر جب حکومت خود ہی ایک دوسرے پہلو میں عوام کو لوٹنے اور تباہ کرنے پر زندہ ہو۔ تو اس سے یہ توقع کیسے رکھی جا سکتی ہے۔ کہ وہ سود خواروں کا راستہ روکے گی۔ چنانچہ ڈوگرہ راج اور سود خواری اکٹھے پیدا ہوئے۔ اور ۱۸۴۶ء سے پورے اسی سال تک جموں وکشمیر کی سرزمین میں سود خواری پوری بے لگامی کے ساتھ بڑھی اور ترقی کرتی گئی۔ نقدی سود، جنسی سود، سود در سود، دُردوڈ کی نئی نئی قسمیں رائج ہوئیں۔ اور ہر ایک کو حکومت کی "تائید اور امداد حاصل رہی۔ عدالتیں سود خواروں کو منہ مانگی ڈگریاں دیتی رہیں۔ اور ان کو "معصوم اور فرشتہ" تصور کر کے ان کے بہی کھاتوں پر کامل ایمان لانا ہر ایک عدالت کا فرض رہا۔ جب یہ حالت دیکھی تو ہندوؤں کے علاوہ مسلمان تاجر بھی ڈوگرہ قانون کو اپنا مددگار پا کر اس خون خواری میں شریک ہو گئے۔ جس کو اسلام نے حرام اور ناپاک قرار دیا تھا۔ اور حیلوں بہانوں سے مردار کھانے لگے۔ اور پیٹ میں جہنم کی آگ بھرنے لگے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ عوام کی جو کمائی جاگیرداروں، رشوت خوروں اور درندوں سے بچ گئی۔ وہ ساہوکاروں اور وڈھ داروں کے پاس چلی گئی۔ اور جب کوئی شخص ایک بار سود خوار کے پنجے میں پھنس گیا۔ تو اس کی سات پشتیں تک سود ادا کرتی رہیں۔ اور پھر بھی اس چکر سے باہر نہ جا سکیں۔ اس

نے سودی کاروبار کرنے والی جونکوں کو نہ صرف عوام کی محنت سے پیدا ہونے والی ہر جنس اور زرعی پیداوار کا پیشگی مالک بنادیا۔ بلکہ بعض علاقوں میں مقروضوں کی بہو بیٹیوں کی عزت و عظمت بھی اِن درندوں کے رحم وکرم پر رہ گئی۔

سعی لاحاصل

۱۹۲۶ء میں پنجاب کے بعض قوانین سے متاثر ہو کر اس ریاست میں بھی "دادرسی اشخاص زراعت پیشہ" کے نام سے ایک قانون رائج کیا گیا۔ لیکن وہ اتنا کمزور تھا۔ اور اس کو چلانے کا طریقہ اتنا فرسودہ تھا کہ چھ مہینہ تک اس پر عمل نہ ہوا۔ اور بالآخر چالاک سودخواروں کی مخالفت اور مکارانہ شور وغل میں وہ گم ہو کر رہ گیا۔ قانون تو موت کی گھاٹ اتر گیا۔ اور سودخواری جوں کی توں آج بھی موجود ہے۔ اور جب تک یہ نظام حکومت ختم نہیں ہوتا موجود رہے گی۔

ہمہ گیر رشوت

تباہ کاری کا تیسرا رکن یعنے سرکاری اہلکاروں کی رشوت خوری اگرچہ آج کل ہندوستان میں بھی چاروں طرف عوام کی شکوہ سنجی کا موجب بنی ہوئی ہے۔ لیکن ریاست کشمیر میں ڈوگرہ راج نے پورے سو سال سے اس کی مسلسل دیکھ بھال اور پرورش کی ہے۔ اور رشوت کو ایک "باقاعدہ صنعت" بنادینے کا سہرا ریاست کشمیر کے ہی سر ہے۔ آج اس کے جو بہتر بہدف طریقے کشمیر میں رائج ہیں۔ وہ باقی دنیا کے راشیوں نے خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں گے۔ یہ تو ایک مسلمہ عام بات ہے کہ اب ریاست کشمیر کے سرکاری ملازموں اور ان کے لگے بندوں کی سوسائٹی میں آج کل رشوت خوری کو کوئی عیب ہی نہیں سمجھا جاتا۔ اور مجلسی تعلقات میں کسی سرکاری ملازم کے لئے دیانتداری کا وصف عزت کا امتیازی نشان نہیں رہا۔ اور نہ مسلمہ اور رسوا شدہ بددیانتی اس کے احترام میں کمی کا موجب ہے۔ مجلسی اخلاق کا ایسا ہیبت ناک تنزل برس دو برس میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ پورے ایک صدی کے حالات کی پیداوار ہے۔ ملازمت جو دنیا میں گدائی کے دوسرے درجہ پر ذلیل ذریعۂ زندگی شمار ہوتی تھی۔ اس کے لئے آج

اگر کشمیر میں غرضمند لوگ ایک فرقے کو دوسرے فرقے کے ساتھ لڑانے رہتے ہیں. تو اس کی کئی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ رشوت نے ملازمت کو ہزاروں اور لاکھوں کی آمدنی کا ذریعہ بنادیا ہے. ملازمت کے سہارے عوام کو کتنا لوٹا جاتا ہے. اگر آپ اس کا اندازہ کرنا چاہیں. تو پٹواریوں، فارسٹ گارڈوں اور اسی درجے کے دوسرے معمولی برائے نام تنخواہیں لینے والے اہل کاروں کی پیدا کردہ جائدادوں، تعمیرات اور ان کے امیرانہ طرزِ معیشت اور کرّوفر کا جائزہ لیں. آخر آٹھ آنے یومیہ تنخواہ پانے والے ملازم کو اپنے تھان پر بندھے ہوئے گھوڑوں اور نازونعم سے پالے ہوئے کتوں پر روزانہ تین چار روپیہ خرچ کرنے کا تماشہ دیکھ کر آپ سوائے اس کے اور کیا کہیں گے. یہی کہ اس کو کہیں سے لکھشمی مل گئی ہے! یقین کیجئے کہ یہ لکھشمی "رشوت ماتا" ہی تو ہے۔

یہ تو ادنیٰ ترین ملازموں کی حالت ہے. اس سے بڑے درجے کی ملازمتیں تو رشوت کی برکت سے مسلمہ طور پر لکھشمی بنانے کی پہلی سیڑھی ہیں. یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں کہ رشوت کے ذریعہ عوام کو جس قدر لوٹا جارہا ہے. اس کی مجموعی مقدار سرکاری خزانے کی آمدنی سے کئی گنا زیادہ ہے. مثلاً اگر خزانۂ عامرہ کو بھرنے کے لئے براہ راست ٹیکسوں کے ذریعہ عوام ڈھائی تین کروڑ روپیہ دیتے ہیں. تو ملازموں کو رشوت کی صورت میں جو کچھ دینا پڑتا ہے. اگر اس کے اعداد و شمار حاصل کرنے کی کوئی صورت ہو جائے. تو رشوت کی مجموعی مقدار آٹھ دس کروڑ سالانہ سے کم کسی طرح نہ ہوگی. یہ لوٹ کھسوٹ کہیں فرض فروشی اور اکثر اوقات استحصال بالجبر کی شکلوں میں ہوتی ہے. رشوت گیری کی اس افراط کا سبب ڈوگرہ نظام حکومت کی مخصوص ساخت اور اس کے طرزِ عمل پر ہی غور کرنے سے سمجھ میں آسکتا ہے.

قانونی رشوت خوری

ڈوگرہ حکومت کے ابتدائی دور میں رواج تھا کہ سرکاری ملازموں کو معمولی سی تنخواہیں دیکھ نہیں. قانونی حق کے طور پر اجازت دی جاتی تھی کہ وہ جہاں جائیں عوام سے کھانا اور خدمت مفت میں حاصل کریں

جس کو "روزِ رسد اور بیگار" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ جس گاؤں میں سرکاری ملازم پہنچ جاتا۔ گاؤں والوں کا فرض تھا کہ وہ اس کی حسب منشاء کھانے کا تمام انتظام مہیا کریں۔ وہ جب تک وہاں رہے۔ اس کی خدمت میں حاضر رہیں۔ اور جب وہاں سے دوسری جگہ جانا چاہے۔ تو اس کا بوجھ اٹھا کر اور اکثر اوقات اس ملازم کو اور اس کے بال بچوں کو بھی پالکیوں میں اٹھا کر ان کو منزلِ مقصود تک پہنچائیں۔ اور اس رسد۔ خدمت و بیگار کیلئے وہ کسی معاوضے کے مستحق نہیں سمجھے جاتے تھے۔ بلکہ تصور یہ تھا کہ جس طرح اپنے مقبوضہ کھیت کا مالیہ ادا کرنا اور اپنے مویشی کے لئے ٹیکس کا بچرائی دینا ان پر واجب ہے۔ اسی طرح سرکاری ملازمین کی خورد و نوش اور باربرداری کا انتظام کرنا یعنے "روزِ رسد اور بیگار" بھی ایک رعایاتی کے لئے وفادار رعایا ہونے کا قانونی ثبوت ہے۔ اور جس نے "روزِ رسد و بیگار" ادا کرنے میں ذرا بھی حیلہ و حجت کی۔ تو یہ بغاوت سمجھی جاتی تھی۔ اور ایسا کرنے والے کی خانہ ویرانی کے لئے کافی وجہ بن سکتی تھی۔ اس "روزِ رسد اور بیگار" کے لئے کوئی معیار معین نہیں تھا۔ ایک سرکاری ملازم اپنی ہوس کی تسکین کی حد تک استفادہ کرنے میں آزاد تھا۔ اور اس لعنت نے ملازمین کو یہ یقین دلا دیا تھا۔ کہ وہ عوام پر اور ان کی تمام مملوکہ چیزوں پر مالکانہ حق رکھتے ہیں۔ اور یہی یقین تھا کہ جس نے ان لوگوں کو روزِ رسد کے ساتھ ساتھ بے کھٹکے نقد رشوت وصول کرنے کی طرف پہلے پہل رہنمائی کی۔ جس کے بعد یہ صورت ہو گئی۔ کہ سرکاری آفیسر کے آنے کی اطلاع پاتے ہی گاؤں کے نمبردار جہاں گاؤں کے ہر ایک گھر سے خوراک کے لئے آٹا، چاول، گھی اور انڈا، مرغ وغیرہ جمع کرنے میں مصروف ہو جاتے۔ وہاں آنے والے آفیسر کی حیثیت کے مطابق نذرانہ پیش کرنے کے لئے چار آنے، آٹھ آنے یا روپیہ فی گھر کے حساب سے اکٹھا کرنا شروع کر دیتے۔ اور گاؤں میں قیام و طعام کے بعد جب آفیسر رخصت ہونے لگتا۔ تو اس جمع شدہ رقم کا بڑا حصہ نہایت ادب و احترام کے ساتھ اس کی خدمت میں پیش کر کے رقم کی کمی کے لئے گاؤں کی غریبی کا عذر پیش کیا جاتا!

اور باقی رقم اس افسر کے ماتحت اہل کاروں میں درجہ بدرجہ تقسیم کردی جاتی جو بڑے دار قدرے تجربہ کار اور خرانٹ بن جاتے۔ وہ اس میں سے اپنے لئے بھی کچھ نہ کچھ بچا لیتے۔ ورنہ ان کے لئے یہی کافی تھا کہ مار پیٹ اور توہین وتذلیل سے جان بچ جائے۔ اور یہ ورد کرتے ہوئے گھر کو لوٹیں کہ "جان بچی اور لاکھوں پائے خیر سے بدھو گھر کو آئے"۔ یہ لوٹ کھسوٹ کوئی چھپی ہوئی چیز نہ تھی۔ مہاراجہ، وزرا اور گورنروں سے لیکر پٹواری اور چپڑاسی تک سب کو اس کی نسبت ایک جیسا علم تھا۔ مگر اس کو روکنے کی کبھی کوئی کوشش عمل میں نہیں آئی۔ بلکہ بعض بڑے راشیوں کے کارنامے شاہی مجلسوں میں فخر سے بیان کئے جاتے تھے۔ اور اس کے لئے کبھی ان سے بازپرس نہ ہوتی تھی۔

ایک خاص سبب اس نظام کے ابتدائی دور میں رشوت خوری کے پھیلنے کا سبب روزِ رسد اور بیگار کے علاوہ یہ بھی تھا کہ یہاں گلاب سنگھ وغیرہ ڈوگرہ مہاراج کسی فریادی کی فریاد اس وقت تک نہ سنتے تھے جب تک وہ نقد روپیہ لیکر اس کی خدمت میں پیش نہ ہوتا۔ اور نقد روپیہ دکھا کر راستے میں بھی ہر ایک فریادی ڈوگرہ مہاراجہ کو روک کر عرض کرسکتا تھا۔ اگرچہ یہ رسم ایک قسم کا شاہی نذرانہ اور کورٹ فیس تصور ہوتی تھی لیکن رسم کا بے ڈھنگا پن اہل کاروں کو یہی سبق دیتا تھا کہ وہ اپنے فرض کی ادائیگی کے وقت عوام سے روپیہ وصول کریں۔ اگر مہاراجہ رسم کے طور پر وصول کرتا تھا۔ تو اہل کاروں نے اس کو دولت جمع کرنے کا آسان ذریعہ بنالیا۔ اور "ناستہ مشکہ" "چائے دامہ" اور "پان سگریٹ" کے نام سے سالانہ کروڑوں روپیہ کے لین دین کی رسم جاری ہوگئی۔ اور حضرت شیخ سعدیؒ کا یہ فلسفیانہ ارشاد سچ ثابت ہوا کہ ؎

اگر ز باغِ رعیت مَلِک خورد سیبے
برآورند غلامانِ او درخت از بیخ!

اخلاقی زوال یہی تین وہ اسباب تھے۔ جن کی وجہ سے آج اس ریاست کے عوام

کو سب سے زیادہ بے دردی کے ساتھ لوٹنے والا طبقہ اس ریاست کے رشوت خور، فرض فروش اور بددیانت سرکاری ملازم ہیں۔ اور رشوت خوری جو عملاً چوری، ڈاکہ، جیب تراشی خیانت اور لوٹ کے مجموعے کا نام ہے جموں وکشمیر میں مجلسی عیب ہی تصور نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ بعض طبقوں میں زیادہ رشوت خور (اوپر کی آمدنی والا) اہل کار داماد بنانے کے وقت قابل ترجیح "بر" خیال کیا جاتا ہے۔ اس اخلاقی زوال کی وجہ سے ریاست کا دفتری نظام اوپر سے لیکر نیچے تک گندہ ہو چکا ہے۔ اور اس کے اہل کار ایک جرائم پیشہ جماعت بن کر رہ گئے ہیں۔ جن کی خون خواری کی پیاس بجھائے بغیر عوام کی جان، ان کا مال اور ان کی آبرو کوئی چیز بھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اس تباہی سے کشمیر اور جموں کے چالیس لاکھ انسانوں کو اب صرف ایک ہی چیز بچا سکتی ہے۔ اور وہ یہی ہے کہ اس جرائم پیشگی کو پیدا کرنے اور اس کو سہارا دینے کی ذمہ داری جس نظام پر عائد ہوتی ہے۔ وہ جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔

ان سے نجات کیسے ہو؟

یہ ہیں جاگیرداری، سود خواری اور رشوت خوری کی وہ بڑی برائیاں جنہوں نے جموں وکشمیر کی چالیس لاکھ آبادی کو اس وقت منافع بازیوں، ذخیرہ اندوزیوں اور دوسری خرابیوں کے حوالے کر کے بھوک، برہنگی اور بے خانہ مانی پر مجبور کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے ایک ایسے کشمیر کا تصور کیجئے جس کو مندرجہ صدر تین برائیوں سے نجات ہو جائے۔ اور خود اندازہ لگایئے کہ جاگیرداری۔ سود خواری اور رشوت سے نجات کے بعد غلامی کے کتنے بڑے قلعے ہیں۔ جو فتح ہو جائیں گے۔ اور عوام پر آزادی کی کتنی راہیں کھل جائیں گی۔ جاگیرداری، سود خواری اور اشیانہ دفتری نظام کے خاتمہ کے بعد اس چالیس لاکھ آبادی پر ترقی اور خوشحالی اور آزادی کے وہ کونسے دروازے ہیں۔ جو بند رہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ تینوں تباہیاں جس حاکمانہ دور کی پیداوار ہیں۔ جب تک وہ موجود ہے۔ یہ بھی موجود رہیں گی۔ اور جب میدان میں ان کا یہ سہارا نہیں رہے گا۔ تو یہ بھی بستر اگول کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔

ڈوگرہ راج کی دیگر برکات

"جاگیرداری، سود خواری اور رشوت خوری یہ تین امور تباہی کا بنیادی سبب ہیں۔ جن کی طرف اس تمہید میں اشارہ کرنا ضروری تھا۔ ان کی بے شمار شاخوں اور ان کے علاوہ اس حکومت کے پچھلے سو سالہ دور میں یہاں کے باشندوں پر روا رکھے ہوئے باقی ظلموں کی تفصیلات اتنی لمبی ہیں کہ ان کو واضح کرنے کے لئے کسی "ملز مانہ" بیان میں گنجائش نہیں نکل سکتی۔ یہ تاریخی تذکرہ ہے کہ گلگت کی بیگار کے لئے پکڑے ہوئے کشمیری دیہاتی جب راستہ میں دم توڑ دیتے تو ان کے وارثوں پر متوفی کی لاشیں ٹھکانے لگانے کے بدلے اس کے بوجھ کو منزل مقصود پر پہنچانے کی ذمہ داری کس طرح عائد ہوتی تھی؟ کشمیر کے کسان کی پیداوار اس سے چھین کر اس کو جنگلی گھاس کھا کر زندہ رہنے یا ہمیشہ کے لئے کشمیر سے جلاوطن ہو جانے پر کس طرح مجبور کیا جاتا تھا؟ یہاں کے کاریگر کی کمائی نئے نئے ٹیکسوں کے ذریعہ کس طرح لوٹ لی جاتی تھی؟ اور عوام کو باہم مسلسل لڑائیوں میں مبتلا کر کے اپنی آزادی سے غافل رکھنے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کئے جاتے تھے؟ یہ سب تفصیلات اُس "تاریخ نویس" کا حصہ ہیں جو اس صدی کے حالات قلمبند کرے گا۔ ان حالات کا اکثر حصہ اس قدر وحشیانہ افعال کا مجموعہ ہے۔ کہ آج کل کوئی مورخ یہ امید نہیں کر سکتا کہ اس کی کتاب ان صداقتوں پر مشتمل ہونے کے بعد موجودہ حکومت کے دور میں ضبط ہونے سے بچ جائیگی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دیانتدار مورخین نے پچھلی ایک صدی کے جو حالات قلمبند کئے ہیں۔ وہ انہیں شائع کرنے کی ہمت نہیں کرتے۔ اور چند ایک زر پرست چاپلوسوں نے "ڈوگرہ دور کی تاریخ" قرار دیکر جو کچھ لکھا ہے اور شائع ہوا ہے۔ وہ اصلیت سے کوسوں دور ہے اگر کسی نے سوبناوٹی خوشامدوں کے ساتھ ایک سچی بات بھی لکھ دی ہے تو اس کی تحریر بحق مہاراجہ بہادر ضبط ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن وقت آ رہا ہے۔ جب یہ پوست کندہ

حالات گوٹوں اور کھدروں سے نکل کر لائبریریوں، دار المطالعوں اور تحقیق گاہوں کی میزوں پر آجائیں گے۔ اور دنیا انہیں دیکھ کر دنگ رہ جائیگی۔ اس وقت ہر شخص کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ کشمیر پہ مغل دور، افغان دور اور سکھ دور میں جو ظلم وستم ہوا تھا۔ ڈوگرہ دور میں اس کی مجموعی مقدار سے دس گنا زیادہ تباہیاں اور ہلاکتیں اس خطہ کے باشندوں پر روا رکھی گئیں۔ اور اس انسانیت کشی کے بعض ایسے گھناؤنے پہلو بھی سامنے آئیں گے۔ جن کی نظیر پیش کرنے سے دنیا بھر کی تاریخ قاصر رہے گی۔

کشمیر اور باقی دنیا

اب اس حقیقت کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں کہ ہماری پسماندگی پچھلے تین سو ساڑھ سال کی مسلسل غلامی کا نتیجہ ہے۔ اور یہی غلامی تھی جس نے ہماری جسمانی اور ذہنی قوتوں کو اس قدر معطل کر دیا کہ گذشتہ انیسویں صدی کے دوران میں دنیا بھر کی اقوام نے سیاسی حالات سے علمی لحاظ سے اور اقتصادی لحاظ سے ترقی کی۔ مطلق العنانیت، شہنشاہیت، اعیانیت، دستوری مشروطیت، جمہوریت وغیرہ تمام سیاسی انقلاب ایک ایک کرکے بروئے کار آئے۔ اقتصادی دائرے میں جاگیرداری، سرمایہ داری اور صنعتی دور کے بعد اشتراکیت تک نوبت پہنچی۔ علمی دنیا میں تمام قدیم فلسفانہ قدریں ختم ہو کر تصوارت، نفسیات اور اخلاقیات کی نئی قدریں وضع ہوئیں۔ طبعی تحقیقات کے دائرے اتنے وسیع ہو گئے کہ ہزاروں برسوں کی "ساکن" زمین چکر میں آگئی۔ اور بچارے آسمان کا وجود تک خواب وخیالی ہو کر رہ گیا۔ معدنیات، پانی، ہوا اور بجلی کی طاقتوں کو آزاد انسان نے مسخر کرکے "حرکت وسکون" "نزد ودور" اور "وقت ومقام" کے تمام پرانے مسلمہ دستور بدل ڈالے۔ کرہ ارضی کے تمام ممالک کو جدید ذرائع نقل وحمل اور رسل ورسائل نے ایک دوسرے سے اس طرح قریب اور وابستہ کر دیا۔ جس طرح ایک معمولی مکان کے کمرے باہم ملحق ہوتے ہیں۔ اپنی حفاظت

اور تھا یا دوسروں پر حملہ اور جفا کے لئے انسان جن مدافعانہ یا جارحانہ ہتھیاروں کو ہزاروں سال سے استعمال کرتا تھا۔ وہ تیر و تلوار سے ترقی کر کے اٹم بم تک پہنچ گئے۔ محض علم کے زور سے انسان نے سمندروں، صحراؤں، کہساروں، فضا اور ہواؤں کو مسخر کر کے اپنا خادم بنالیا۔ اور عملاً ثابت کیا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے۔ وہ بنی نوع انسان کے لئے ہے۔ غرضیکہ دنیا میں یہ سب کچھ ہوا۔ مگر اس پورے عرصے میں غلامی کی" برکت" سے کشمیر نے دقیانوسیت پر رہنے کا ریکارڈ مات کر دیا۔ اور اس کے باشندے اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ سرک سکے۔

غلامانہ یاس پرستی

اکثر ترقیات و تغیراتِ زمانہ کا تو کشمیریوں کو علم تک نہ ہوا۔ اور اگر علم ہوا بھی۔ تو شوقِ پرواز پر تازیانہ لگانے کے بدلے ان کے مفلوج دماغ نے ان کے سامنے یاس پرستانہ قناعت و جمود کا فلسفہ پیش کیا۔ اور جاہلانہ پست ہمتی اور غلامانہ پست فطرتی کو تسلی دینے کے لئے کشمیری برسوں ہمچو قسم خیالات کے چکر میں پھنسے رہے کہ" دنیاوی ترقیات زوال پذیر چھاؤں ہیں۔ مایا ہیں۔ ان کا حصول و عدم حصول مساوی ہے"۔ وہ ترقی کرنے والی قوموں سے بزبان حال کہتے رہے کہ ؎

ہوا میں تیرتے پھرتے ہیں تیرے طیارے
میرا جہاز ہے محروم بادبان پھر کیا
میرے نصیب میں ہے دو جہاں کی محرومی
تیری مراد یہ ہے۔ دور آسماں پھر کیا

قوی شدیم چہ شد، ناتواں شدیم چہ شد
چنیں شدیم چہ شد، یا چناں شدیم چہ شد

ہیچ گونہ دریں گلستان قرارے نیست
تو گر بہار شدی، ما خزاں شدیم چہ شد

یہ فلسفہ "مشیتی" انہیں کبھی کبھی خدا کی رحمت سے انکار اور اپنی ممکنات سے مایوس کر اکے خطرناک مشرکانہ عقیدے تک پہنچا دیتا تھا۔ اور وہ اپنی غفلتوں، بداعمالیوں اور نالائقیوں کے نتیجہ میں وارد شدہ غلامی کو خدا اور تقدیر کی طرف منسوب کر کے یہ سمجھتے کہ خدا ہی نے ڈوگرہ راج کو تمام بے لگامیاں عطا کی ہیں۔ اور ہمیں اس کی غلامی غیر مشروط اطاعت اور حیوانوں کی طرح زندگی بھر اس کی خیر خواہانہ خدمات انجام دینے کے لیے خلق کیا ہے۔ یہ حالت تھی تو دردناک لیکن قابل تعجب نہ تھی کیونکہ غلامی قوموں کے دل ودماغ کو مسخر کر کے اس درجہ پر پہنچایا ہی کرتی ہے کہ وہ اپنی شکل وصورت بھی نہیں پہچان سکتے۔

قانونِ حیات

یہ ناممکن تھا کہ کشمیر کی سرزمین دنیا کی ہونے والی تبدیلیوں سے ہمیشہ کے لیے غیر متاثر رہے۔ پیر پنچال کی اٹھارہ ہزار فٹ اونچی چوٹیاں جس طرح وتستا اور کشن گنگا کے پانی کو پنجاب کا راستہ اختیار کرنے اور سندھ کے ساتھ ہم آغوش ہو کر سمندر میں جا شامل ہونے سے نہیں روک سکتیں۔ اسی طرح وہ موجودہ زمانے کے انقلاب کی تحریکوں، اجتماعی ترقیات کے نئے نئے ذریعوں اور سماج کے نئے تصورات کے راستے میں بھی حائل ہونے سے قاصر ہیں۔ نشر واشاعت کے نئے وسیلوں اور نامہ وپیغام اور میل جول کے جدید ذرائع نے وہ دیواریں اب ہٹا دی ہیں۔ جو آج سے کچھ مدت پہلے تک کشمیر کو باقی دنیا سے الگ تھلگ رکھنے میں کامیاب تھیں۔ آج لندن، دہلی اور سرینگر کے باشندے ایک خبر کو ایک ہی وقت میں سنتے ہیں اور اس سے ایک جیسے نتائج حاصل کرتے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے عمل میں اب وہ تفاوت قائم رہے۔ جو آج تک قائم تھا۔ یہ وقت کا فیصلہ ہے اور کشمیر کی بیداری

کا سبب ڈھونڈنے والوں کو وقت اور زمانے کے تقاضوں میں ہی اپنے سوال کا جواب ملے گا۔

قوم نے کروٹ لی

اگرچہ سنہ ۱۹۴۶ء سے سنہ ۱۹۳۱ء تک کشمیر میں ایک مسلسل سیاسی موت چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن بیداری کے اثرات سنہ ۱۹۳۱ء سے کچھ پہلے ہی محسوس ہونے لگے تھے۔ سیاسی موسم کی عالمگیر تبدیلی سے بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں کشمیریوں نے سب سے پہلے جس اجتماعی اور قومی ضرورت کا احساس کیا، وہ تعلیم جدید کی ضرورت تھی۔ علی گڈھ۔ بنارس اور دیوبند کی تعلیمی تحریکات سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں نے اس ریاست میں بھی تعلیم کی کسی نہ کسی شاخ کو فروغ دینا چاہا۔ مروجہ تعلیم کی نسبت پہلے پہل یہ پکار صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ لیکن کچھ مدت کے بعد ریاست کے شہروں جموں و سرینگر میں ایک مختصر سا حلقہ جدید تعلیم کی حمایت کرنے والا پیدا ہو گیا۔ اور چند سال بعد مسز اینی لبسنت اور صاحبزادہ آفتاب احمد کے دوروں نے کشمیر کو بھی ہندوستان کے تعلیمی نقشے میں جگہ دے دی۔ تعلیم جدید نے شہری حلقہ کی آنکھوں سے خواب غفلت کا پردہ ہٹانے میں ابتدا کی تھی۔ اس کے بعد سنہ ۱۴ء سے سنہ ۱۸ء تک کی جنگ عظیم نے کشمیریوں کو مزید جھنجوڑ کر جگایا۔ اور وہ چوکنے ہو کر جنگ کی خبریں سننے لگے۔ اور کچھ اپنی نسبت بھی سوچنے لگے۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد ہندوستان میں کانگرس اور خلافت کی تحریک کا جو جھگڑا چلا۔ اس میں اگرچہ اہل کشمیر نے عملاً کوئی حصہ نہیں لیا۔ لیکن وہ پورے غور سے اس کا مطالعہ کرتے رہے۔ اور حکومت برطانیہ ایسی ایک طاقتور سلطنت کے مقابلے میں ہندوستان کے نہتے عوام کی کامیاب بہادرانہ کوشش سے سبق لے کر اپنی تدبیروں کے نقشوں میں رنگ بھرنے لگے۔ اور اپنی عوامی طاقت اور ڈوگرہ حکومت

کی طاقت کا موازنہ کرنے لگے۔

زندگی کا پہلا ثبوت

جب کشمیر والوں کی دماغی بیداری پنجاب اور ہندوستان کی تحریکوں کو سمجھنے کے قابل ہوگئی۔ وہ اپنے اندر نئے جذبات کا ایک طوفان سا محسوس کرنے لگے۔ اور سنہ ۲۴-۱۹۲۳ء میں کشمیر کا انسان عجیب بیقرار سا رہنے لگا۔ گویا کسی نامعلوم جذبے کے تحت اس کے دماغ کے رگ و ریشہ میں کوئی ایسی طاقت گھس گئی ہے۔ جو اس کو چیخنے اور چلانے پر مجبور کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ چیخ اٹھا۔ اور کشمیر کی تاریخ میں جن واقعات کو لارڈ ہارڈنگ کے سامنے اکابر کشمیر کا محضر نامہ، دریائی جلوس کے وقت خانقاہِ معلّیٰ کے کالے پردوں کا مظاہرہ اور مزدوران ریشم خانہ کی شورش کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ اس ابتدائی چیخ و پکار کا دوسرا نام ہے۔ یہ چیخ سن کر ڈوگرہ راج کچھ دیر کے لیے جو اس باختہ ہوگیا۔ کیونکہ یہ ایک ایسی قوم کی چیخ تھی۔ جس نے پورے اسی سال ایک مردہ لاش کی طرح ایک ہی کروٹ لیٹے بستر میں گذارے تھے۔ اور غلامانہ وفاداری کے راستہ سے بال بھر انحراف بھی نہ کیا تھا۔

ڈوگرہ راج کی گھبراہٹ

۸۰ سال کے دوران میں ڈوگرہ حکومت نے کشمیریوں سے اُف تک نہ سنی تھی۔ اس نے محضر نامہ پیش کرنے والوں، خانقاشیوں اور مزدوروں کے مظاہرے کو "ناقابل معافی بغاوت" کا اقدام قرار دیکر تحریک کی نوخیز کونپل کو ہی مسل دینے کے لیے پورے تشدد اور ظلم سے کام لیا۔ اور قید و بند و جلاوطنیوں سے ڈرا کر انقلابات کی ناپختہ قوتوں کو کچھ دیر تک چپ ہو جانے کے لیے مجبور کر دیا۔ اس تشدد کے بعد کشمیری ایک طرف اپنی تازہ چوٹوں کو سہلانے لگے۔ اور ساتھ ہی پہلے مہاراجہ کی موت پر سر ہری سنگھ کی گدی نشینی سے توقعات باندھنے میں مصروف ہو گئے۔ کیونکہ پرانا غلامانہ ذہن اپنی تقدیر کو اسی

قسم کے تغیرات سے وابستہ سمجھتا تھا

عارضی خاموشی کے بعد بھونچال

چنانچہ ۲۵ء سے ۳۰ء تک کشمیر پر مایوسی اور خاموشی کی فضا چھائی رہی۔ اسی اثنا میں ایک طرف تعلیم کا دائرہ کشمیر میں وسیع ہو گیا۔ دوسری طرف سرکاری دفتروں کی حدود میں "ریاستی و غیر ریاستی" امتیاز ذات کے سوال نے غیر شعوری طور پر "کشمیر کشمیری کے لئے" کا احساس پیدا کیا۔ (جو ایک قدم آگے بڑھ کر "ہندو مسلم حقوق" کی شاخیں پیدا کرنے کا موجب ہوا) تیسری طرف ہندوستان کی تحریک میں نئے واقعات اور حادثات پیش آئے۔ (۱) راوی کے کنارے کانگرس نے ہندوستان کی کامل آزادی کو اپنا نصب العین بنانے کا اعلان کیا۔ (۲) پارلیمنٹ کے بھیجے ہوئے کمیشن کا بمبئی سے لیکر لاہور تک ہر جگہ کالی جھنڈیوں سے استقبال ہوا۔ (۳) ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈروں نے پولیس کی لاٹھیاں کھائیں۔ (۴) نوجوان پارٹیاں کانگرس سے بھی چار قدم آگے بڑھ کر "ظلم کا انتقام" لینے اور وطن کو خون دے کر آزاد کرنے کے لئے میدان میں اتریں۔ اور (۵) کانگرس کی "نمکین سول نافرمانی" جو ڈانڈلی مارچ سے شروع ہو کر ارون گاندھی سمجھوتہ پر ختم ہوئی۔ اس نے ساڑھ ہزار ہندوستانیوں کو جیلوں میں بھر دیا (۶) کشمیر کی دیوار سے دیوار جس ہمسایہ کی ملی ہوئی ہے۔ وہ صوبہ سرحد ہے۔ سرحد کا مجسمہ حریت پٹھان جو اب تک خاموش تھا۔ اب اس نے بھی پرانی رسم توڑ ڈالی۔ اور مشین گنوں کے سامنے سینے کھول کر پشاور کے قصہ خوانی بازار کو نوجوانوں کے خون سے لالہ زار بنا دیا۔ یہ واقعات کشمیر کے چاروں طرف ہو رہے تھے۔ اس ہنگامے کو دیکھ کر کشمیر کے باشندوں نے بھی اپنے انسانی فرض کو محسوس کیا۔ اور چار صد سالہ غلامی کی زنگ خوردہ بیڑیوں کو توڑنے پر یہ کہہ کر آمادہ ہو گئے کہ سہ

نالۂ بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں؟

چشمہ ابل پڑا اس طرح سنہ ۱۹۳۱ء میں آزادی کی تمنائے کشمیریوں کے دلوں میں کروٹ لی معمولی سی کروٹ نہیں۔ نہایت ہنگامہ خیز کروٹ! ان کے دل سے بے پناہ جذبے اٹھے۔ اور انہوں نے دماغ کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور جس کشمیری نے مغل کو مفت میں اپنی آزادی سونپ دی تھی جس نے سر جھکا کر افغان سے "پدر سوختہ" اور سکھ سے "ہٹو" کا خطاب حاصل کیا تھا۔ اور جو ڈھیکا کہلا کر بھی ڈوگرہ حکمرانوں کو "جے دیوا" کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ وہ تمام پرانے رسم و راہ کو ختم کر کے آزادی کا وہ راستہ اختیار کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ جو ہر ایک خوددار انسان کا اولین شریفانہ فرض ہے۔ مگر غاصب طاقتیں اس کی اہمیت گھٹانے کے لئے اسے "بغاوت" کے نام سے پکارتی ہیں

توڑ ڈالیں فطرت انسان نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشم آدم کب تلک

رہنما کی تلاش اب کشمیر کے تمام انسانوں کے دماغ سے جوش آزادی ابل پڑا تھا۔ لیکن لمبی غلامی نے جسم کے تمام اعضا کو شل کر رکھا تھا۔ تین سو ساٹھ سال تک جہاں ہاتھ پاؤں مدافعت کا فرض انجام دینے سے بیکار تھے۔ اور آنکھوں سے حقیقت بینی اور دماغ سے خودشناسی کی قوتیں محو ہو چکی تھیں۔ وہاں زبان میں بھی نعرۂ حق بلند کرنے کی ہمت باقی نہ تھی۔ اور اب جبکہ دل و دماغ کے نئے جذبوں نے بولنے پر مجبور کیا۔ تو زبانیں جانتی نہ تھیں کہ ادائے مطلب کا کیا ڈھنگ ہوتا ہے۔ دل و دماغ میں سب کچھ ہونے کے باوجود اگر زبان دل کی صحیح ترجمانی

نہ کرے۔ تو کامیابی ناممکن ہے۔ گویا اب کشمیر والوں کی سب سے بڑی ضرورت ایک ہی تھی۔ اور وہ یہ کہ انہیں جہاں محسوس کرنے والا دل و دماغ ہاتھ آ گیا ہے۔ وہاں بولنے والی زبان بھی مل جائے۔ یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ اور اس کو طے کئے بغیر نئے اور پرانے کشمیر کے درمیان حد فاصل قائم نہیں ہو سکتی تھی۔

شیخ عبداللہ کا ظہور

قدرت جب زمین کی نئی زندگی کے لئے زمستان کو بہار میں تبدیل کرتی ہے۔ تو اس کی مہربانی سے کلیوں کو پھول بنانے کے لئے باد نسیم بھی مہیا ہو جاتی ہے۔ جاگے ہوئے کشمیریوں کو ترجمان، قائد اور رہنما سے محروم رکھنا اب تو قانون قدرت کے خلاف تھا۔ اس کا قانون یہی ہے کہ بچے کے پیدا ہونے سے پہلے اس کے لئے شیر کا چشمہ مہیا کرے۔ جب قدرت نے انقلاب کی قوتیں پیدا کر دیں۔ تو تحریک کشمیر کے جہاز کو طوفانوں سے بچا کر لیجانے والا ناخدا فراہم کرنا بھی قدرت کے قدیمی و ازلی اصولوں کا پہلا تقاضا تھا۔ اور اس مقصد کے لئے قدرت کے پوشیدہ ہاتھوں نے جس شخص کی تربیت کر رکھی تھی۔ ٹھیک وقت پر اس کو سامنے لا کھڑا کیا۔ کشمیر کے عوام جو اپنی تازہ پیدا شدہ آرزوؤں کو پورا کرنے کی کوئی سبیل نہ دیکھتے تھے۔ ان کو صدیوں کی طویل مظلومانہ غلامی نے صرف مایوسیوں کا سبق دیا تھا۔ اس لئے مستقبل میں کسی امید کی روشنی دیکھ لینا ان کی تاریکی زدہ آنکھوں کی دسترس سے باہر تھا۔ مگر انہیں ناامیدی کے تاریک غار سے نجات دلا کر تمناؤں اور آرزوؤں کے گلستان میں آباد کرنے کے لئے ناگاہ ایک نوجوان لیڈر مل گیا۔ جس کے وجود میں انہیں اپنی ہر ایک خواہش مجسم ہو کر نظر آئی۔ اور یہ نوجوان شیخ محمد عبداللہ تھا۔

رہنمایانہ اوصاف کا مجسمہ

کشمیر کے عوام کو حریت کے راستہ پر گامزن کرنے اور غلامی سے نجات دلانے کے لئے جن اوصاف کی ضرورت

تھی۔ شیخ محمد عبداللہ کے وجود میں قدرت نے ان سب کو اکٹھا کیا تھا۔ (۱) جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے کی وجہ سے وہ قوم کو نئے تقاضوں کے مطابق منظم کرنے اور کشمیر کی تحریک کو ہندوستان اور دیگر ممالک کی تحریک ہائے آزادی کے دوش بدوش چلانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ (۲) مضبوط اور مستحکم جسم کا مالک ہونے کی وجہ سے وہ ان سختیوں کا کامیاب مقابلہ کر سکتا تھا جو فرعونی طاقتوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا اولین ثمرہ ہوتی ہیں۔ (۳) اس کی روشن دماغی تشکلات سے عہدہ برا ہونے کی کفیل تھی۔ (۴) اس کی جرأت، ہمت اور بے پناہ عزم سے بھرا ہوا دل مخالف طاقتوں کو لرزہ بر اندام کرنے اور کشمیر کے مسلے اور کچلے ہوئے عوام کو بہادری اور بے خوفی کے نمونے دکھا کر ان میں ذہنی انقلاب پیدا کرنے کا معجزنما ذریعہ تھا۔ (۵) اسلام کے ساتھ اس کا روحانی لگاؤ اور بنی نوع انسان سے محبت اور اپنے وطن کی ترقی وخوشحالی کی عشق کی حد تک پہنچی ہوئی تڑپ نے اس کو حریت وآزادی کا منادو نقیب بنا دیا تھا۔ اور یہ سب عناصر اس کے وجود میں کچھ اس طرح جمع ہو گئے تھے۔ کہ وہ ایک کامیاب ترین داعئی انقلاب بن گیا۔ اور اس کی مقناطیسی شخصیت نے کشمیر کی تحریک کو پرخلوص، طوفان خیز اور ناقابل تسخیر بنا دیا۔ اور سب سے بڑھ کر قدرت نے اس کو ایک ایسی فصیح زبان اور بے پناہ قوت بیان عطا کر دی تھی۔ کہ جب وہ ہزارہا انسانوں کے مجمع سے خطاب کرتا۔ تو اس کا ہر لفظ سننے والوں کے دل پر نقش ہو جاتا۔ اور وہ قلب کی گہرائیوں سے محسوس کرتے کہ جو کچھ عبداللہ کہہ رہا ہے۔ وہی سو فیصدی ہمارا احساس۔ جذبہ اور تمنا ہے ؎

"دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

نفسیاتی وحدت لیڈر اور قوم کے درمیان جو نفسیاتی وحدت کسی تحریک کو کامیابی کے درجہ تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے۔ شیخ محمد عبداللہ اس کا بہترین نمونہ ثابت ہوئے

ان کے وجود سے کشمیر کو حق گو اور بے باک انقلاب پرست قائد، قومی اصلاح و تعمیر کا عاشق ریفارمر، وقت کی نبض پہچاننے والا مدبر اور سیاست داں، بڑی سے بڑی طاقت سے بہادرانہ ٹکر لینے والا جرنیل اور ایثار و قربانی سے نہ جھکنے والا سپاہی سب کچھ مل گیا۔

لیس من اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

(قدرت الٰہی کے لئے یہ امر کوئی مشکل نہیں کہ وہ ایک انسان کو مجموعہ خوبیہا بنا دے)

غرض یہ کہ قدرت نے شیخ محمد عبداللہ کے وجود میں رہنمائی کے ان تمام اوصاف کو جمع کر دیا جن کی کشمیر کے مخصوص حالات میں تحریک آزادی کے ہموار نشو و نما اور کامیابی کے لئے ضرورت تھی۔ شیخ صاحب کے یہ رہنمایانہ اوصاف موزوں اور متوازن ہونے کے علاوہ دائمی بھی تھے۔ چنانچہ پچھلے پندرہ سال کے نشیب و فراز جو تحریک کشمیر نے دیکھے۔ وہ اس امر کا ثبوت ہیں کہ شیخ محمد عبداللہ نے رہنمایانہ فرائض انجام دینے کے موقعہ پر اپنے قومی ماحول اور وقت کے تقاضوں اور دنیا کے سیاسی حالات کے اتار چڑھاؤ کو ایک لمحہ کے لئے بھی اوجھل نہیں ہونے دیا۔

رہنمایانہ کارنامے (۱) سنہ ۱۹۳۱ء میں سیاسی پختگی اور جمود و خمود سے عوام کو باہر لانے کے لئے ریاستی آبادی میں سے صرف سب سے زیادہ دبلے ہوئے اور سب سے زیادہ تعداد رکھنے والے فرقہ مسلمانوں کا انتخاب (۲) ان کے مطالبات میں سے عام فہم اور جلدی ہی حاصل ہو سکنے والے مطالبات کو پہلا درجہ دینا (۳) دیہاتی آبادی کے زیادہ نمایاں مطالبوں، ملکیت اراضی، ٹیکس کا اجرائی، اور حقوق جنگلات کو دوسرے امور پر ترجیح دینا۔ (۴) ۳۲ء میں مسلم کانفرنس کا قیام (۵) سنہ ۳۳ء و ۳۴ء میں پریس و پلیٹ فارم کی آزادی اور آئینی اصلاحات کے لئے جد و جہد (۶) سنہ ۳۵ء سے ۳۹ء تک ہندو مسلم اتحاد اور عوامی متحدہ محاذ کے لئے زمین صاف کرنا (۷) سنہ ۳۹ء میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کر کے ریاست کے ہر ایک حریت پرست انسان کے لئے ایک محاذ کا انتظام کرنا۔

(۸) دوسری جنگ عظیم کے دوران میں عوام کو جنگ کے اثرات سے پیدا شدہ مشکلات، ضروریات کی نایابی، گرانی اور دیگر خطرات سے بچانے کے لئے نیشنل کانفرنس کی تمام سرگرمیاں عوام کو روزمرہ امور میں امداد پہنچانے کے لئے وقف کر دینا (۹) ۱۹۴۳ء کے شاہی کمیشن سے مشروط تعاون، کمیشن کے کھوکھلے پن کو تمام دنیا پر اور کمیشن بنانے والوں پر واضح کر دینے کے بعد اس کا بائیکاٹ (۱۰) ۱۹۴۴ء میں "نیا کشمیر" کی ترتیب، (۱۱) اسی سال ڈیارکی سے تجربی، آزمائشی اور مشروط تعاون (۱۲) اور آج ۱۹۴۶ء میں ڈیارکی کے کھوکھلے پن کو عملاً عوام پر واضح کر دینے کے بعد اس کا بائیکاٹ کر کے نہ صرف اہل کشمیر کو بلکہ ہندوستان کی ۵۰۰ ریاستوں میں نو کروڑ تیس لاکھ غلاموں کو مکمل آزادی اور خود مختاری کا راستہ بتانا اور مطلق العنانہ حکومتوں کو آخری چیلنج علین اس وقت پر دینا جبکہ عالمگیر جنگ میں جمہوری محاذ کی کامیابی نے جمہوریت کو ہر ملک اور ہر قوم کے لئے نجات کا واحد ذریعہ ثابت کر دیا ہے۔ اور ہندوستان کو ہندوستانیوں کے حوالہ کر دینے کی نسبت حکومت برطانیہ کے فیصلہ نے نو کروڑ تیس لاکھ ریاستوں پر فرض عائد کر دیا ہے کہ وہ آزاد ہندوستان میں اپنے آئندہ مقام و منصب اور حیثیت و رتبہ کی نسبت نئے حالات کی روشنی میں سوچیں۔ یہ تمام کارنامے جب ایک ترتیب کے ساتھ سامنے رکھے جائیں۔ تو واضح ہو جاتا ہے کہ شیخ محمد عبداللہ نے تحریک حریت کشمیر کی رہنمائی جس سائنٹفک طریقے سے کی ہے۔ موجودہ بیداری کشمیر اس کا قدرتی نتیجہ ہے۔

صحیح قیادت کے ثمرات

انہی رہنمایانہ خصوصیات نے شیخ محمد عبداللہ کو شیر کشمیر اور قائد اعظم کے خطابات کا صحیح مستحق ٹھہرایا۔ اور انہی خصوصیات کا ادنیٰ سا کرشمہ یہ ہے کہ جہاں ۱۹۳۱ء میں کوئی مضبوط سے مضبوط دل گردے کا مالک کشمیری بھی اتنی جرأت نہ کر سکتا تھا کہ پتھر مسجد میں جا کر نماز پڑھ لے۔ یا اس مطالبہ کو ہی زبان پر لائے۔ وہاں آج ۱۹۴۶ء میں ہر کمزور و ناتوان مرد و زن اور بوڑھے اور بچے میں بھی

یہ جرأت وہمت پیدا ہو چکی ہے کہ وہ سٹیج پر آ کر لاٹھیوں، سنگینوں اور گولیوں کے سامنے سینہ تان کر مہاراجہ سر ہری سنگھ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے "ختم کر دو اپنی مطلق العنانی، پھاڑ کر پھینک دو امرتسر کا صد سالہ فرسودہ بیعنامہ جس کو شخصی اقتدار و اختیار کا منبع سمجھتے ہو۔ اور تسلیم کرو کہ اختیار و اقتدار کے حقیقی مالک ریاست کے تمام محنت کش انسان ہیں"۔ سنہ ۱۹۳۱ء اور سنہ ۱۹۴۶ء کے درمیان جو تفاوت ہر شخص کو محسوس ہو رہا ہے۔ یہ ایک ہی دن کے دفعتاً و اتفاقاً واقع ہونیوالے کسی حادثے کا نتیجہ نہیں۔ ان دونوں مرحلوں کے درمیان سینکڑوں مرحلے ہیں۔ اور جب تک ایک قابل ترین قائد قوم کو ہر مرحلے اور قدم پر ٹھیک راستہ بتانے کے لئے موجود نہ ہو۔ قومیں ایسی خوبی سے ان مشکل راستوں کو طے نہیں کر سکتیں۔ شیر کشمیر کی رہنمائی ہمیشہ کچھ اس انداز سے رہی ہے کہ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
زمین اور بھی آسماں اور بھی ہیں

اور تب سے اہل کشمیر کو تحریک کی ہر جدید منزل پر یہی تلقین فرمائی کہ ؎

الجھ کر اسی روز و شب میں نہ رہ جا
ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں

اسی سائنٹفک رہنمائی کا یہ نتیجہ ہے کہ پندرہ برس پہلے جو لوگ غلامی پر صبر و شکر کئے بیٹھے تھے۔ آج "کشمیر چھوڑ دو" کا نعرہ لگا کر اپنے عمل سے بتاتے ہیں ؎

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی میں قائم ہے شان تیری
وفور گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

باطل کا فرعونی جوش

عوام کی بیداری جس فرسودہ فیوڈل ڈوگرہ شاہی نظام کو موت کی دعوت دے رہی ہے۔ اس کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ اپنے خاتمہ کو لبیک کہے۔ اور چپ چاپ بیٹھ کر تحریک آزادیت کے پھولنے پھلنے کا تماشہ

دیکھیے جبر و شر کی آویزش اور جہد للبقاء کے ابدی اصول کے مطابق حق کے بلند ہوتے ہوئے سورج کا مقابلہ باطل کی تاریکی نے کرنا ہی تھا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

چنانچہ ڈوگرہ نظام حکومت نے تحریک حریت کو مٹانے کے لئے بالواسطہ اور بلاواسطہ محاذ قائم کئے اور عوام کی آواز کو دبانے کے لئے عوام کی جیب سے وصول کیا ہوا روپیہ بے دریغ خرچ کیا جس کا سلسلہ سنہ ۱۹۳۱ء سے آج تک جاری ہے۔ اور ابھی بھی جاری رہے گا۔ باطل کی ان مذبوحی حرکات کا اگر تجزیہ کیا جائے۔ تو وہ تین عنوانوں کے تحت آتی ہیں جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جبر و تشدد (۲) تفرقہ بازی (۳) عیاری و مکاری

ان تین عنوانوں کے تحت آنے والے تمام سرکاری اقدامات کی جامع اور بالغ تفصیلات لکھنا میرا اس وقت مقصود نہیں۔ بلکہ صرف یہ بتلانا مطلوب ہے کہ تحریک کشمیر سنہ ۱۹۳۱ء سے اب تک جن مشکلات کا مقابلہ کر کے "کوئٹ کشمیر" کے دور میں داخل ہوئی ہے۔ اپنے بیان کے پس منظر میں ان کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ کیوں کہ اس کے بغیر استغاثہ کے عائد کردہ الزامات کی نوعیت پر کامل روشنی نہیں پڑ سکتی۔ اور نہ میری ملزمیت اس عدالت کے سامنے پورے طور سے اجاگر ہو سکتی ہے۔

جبر و تشدد پہلے عنوان جبر و تشدد کے تحت ڈوگرہ راج کے وہ تمام اقدامات آتے ہیں جن کا سلسلہ ۱۳ر جولائی کو سنٹرل جیل سرینگر کے دروازے پر خود اسی مقام پر جہاں اس وقت آپ کی عدالت قائم ہے اور جہاں میں بطور ملزم کھڑا کیا گیا ہوں) نہتے عوام کے سینے گولیوں سے چھید کر شروع کیا گیا۔ اس کے بعد سرینگر جموں۔ میرپور۔ کوٹلی۔ اسلام آباد۔ اوڑی۔ ہندواڑہ۔ بارہ مولہ۔ سوپور۔ شوپیان

پلوامہ ۔ بیج بہارہ وغیرہ کوئی علاقہ نہ تھا جہاں یہ خونی ڈرامہ سٹیج نہ کیا گیا۔

آج تک اس کا سلسلہ جاری ہے اور اس سال خانقاہ معلیٰ پھر اس چاندماری کا نشانہ بن چکا ہے۔ اور اب کے تو سرینگر و پانپور و اسلام آباد میں عورتوں اور بچوں پر بھی گولیاں چلا کر ڈوگرہ راج نے اپنی "بہادری" کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

گولیوں کے ساتھ ساتھ ٹکٹکیاں، بید زنی، قید و بند، تعزیری ٹیکس، جرمانے، لوٹ کھسوٹ، نئے نئے آرڈی ننس، گلو گیر پابندی اور اسی قسم کے دوسرے اقدام جو سنہ ۱۹۳۱ء سے آج تک یہاں کے عوام نے برداشت کئے۔ اور جن کو آج بھی برداشت کر رہے ہیں۔ وہ بھی اسی جبر و تشدد کا ایک حصہ ہیں۔ جو تحریک آزادی کو ہٹا ڈالنے کے لئے اس فرسودہ نظام حکومت کا پہلا محاذ ہے۔ اور جس کے بل بوتے پر وہ ابھی تک دن گذار رہی ہے۔

تفرقہ بازی ڈوگرہ راج کا دوسرا حربہ بہ قدرے غیر محسوس مگر سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ جو عوام کو جبر و تشدد سے ہزار گنا زیادہ نقصان پہنچا رہا ہے۔ اور وہ ہے تفرقہ بازی۔ ڈوگرہ حکومت کے تجربہ میں یہ بات آچکی ہے کہ اگرچہ عوام کے پاس توپ، بندوق اور مشین گن نہیں لیکن رائے عامہ کا اتحاد اور عوام کی یک جہتی ایک ایسا طاقتور ہتھیار جس کے مقابلہ میں سارے فوجی ہتھیار بے کار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے عوامی اور جمہوری طاقت کو شکست دینے کی ایک ہی سبیل ہے کہ عوام کو متحد نہ ہونے دیا جائے۔ اور ان میں تفرقہ ڈالنے کے لئے کوئی کوشش باقی نہ چھوڑی جائے۔ پچھلے پندرہ سال کے دوران میں تحریک آزادی کے مقابلہ پر جو رکاوٹیں ہندو مسلم جھگڑا، مسلم و مسلم جھگڑا اور دوسری بیسیوں شکلوں میں سامنے آئیں۔ وہ حکومت کے اس دوسرے حربے کی مختلف شکلیں تھیں۔ اگر ان تفرقوں کی تفصیلات لکھی جائیں۔ اور ان کے پیدا کرنے میں حکام کو جو پاپڑ بیلنے پڑے۔ ان کو گنایا جائے۔ تو یہ بیان ایک ضخیم کتاب بن جائیگا۔ یہاں ان تفصیلات

کی نہ گنجائش ہے۔ نہ ضرورت۔ صرف یہ اشارہ کافی ہے کہ ۱۹۳۱ء میں تحریک بیداری کے مقابلہ میں ہندوؤں کو حکومت نے مسلمانوں کو مقابل لاکھڑا کرنے میں جو کمال دکھایا۔ اور اس کے بعد تحریک کے "علمبرداروں" اور پہلی صف کے مجاوروں میں سے ایک حصّے کو ورغلا کر اور اپنے ساتھ ملا کر جو کامیابی حاصل کی۔ وہ سرکاری کوششوں کے ادنیٰ نمونے ہیں۔ حکومت کے اشاروں پر پچھلے پندرہ سال میں جو "انجمن ہائے اصلاح زمینداراں" اور اس قسم کی دوسری جائز و ناجائز پیداوار میں زنجیرِ تفرقہ کی مختلف کڑیاں تھیں جنہیں بعض اوقات عوام کے ایک جھٹکے نے تتر بتر کر دیا۔ (جیسا کہ ۱۹۴۳ء میں جاگیرداروں اور ذیلداروں کو ایک کر کے سیٹھ ہمت سنگھ کی بنائی ہوئی "زمیندارہ انجمن" کا پانچ ماہ میں انجام ہوا تھا) لیکن اکثر اوقات یہ دام اتنا ہم رنگ زمین" بنا کر بچھایا گیا کہ عوام کا کافی حصہ "غنی کشمیری" بن کر اس کا شکار ہو گیا۔

موثر ترین ناپاک حربہ

آج یعنے کشمیر کی عوامی تحریک کے برخلاف ڈوگرہ حکومت جو موثر ترین حربہ استعمال کر رہی ہے۔ وہ یہی تفرقہ بازی کا حربہ ہے۔ اور پچھلے پانچ مہینوں کے واقعات گواہ ہیں کہ جو لوگ خود موجودہ حکومت کے ظلم و ستم سے نالاں ہیں۔ وہ تفرقہ کے اس جال میں پھنس کر کس طرح حکومت کی بساط کے مہرے بنتے رہے ہیں۔ اور اس مجبوری نے انہیں کس طرح ان کی اپنی ہی تردید اور اپنی مخالفت کے مشکل فرائض انجام دینے پر مجبور کیا۔ ایک مشہور شعر ہے کہ ؎

طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا!
کس رہے ہیں اپنی منقاروں سے حلقہ جال کا

جموں و کشمیر کے بہت سے سیاسی "طائروں" پر صیاد کے اقبال کا سحر ہو یا نہ ہو۔ لیکن تفرقہ کے سحر نے ان کی عقل و ہوش پر اس قدر قبضہ کر لیا ہے کہ وہ نہ صرف غداری کے جال کے حلقے ہی کس رہے ہیں۔ بلکہ اپنے ہاتھوں اپنا گلا کاٹنے میں بھی

مصروف ہیں۔ آج کل (۱) کوئٹ کشمیر" تحریک کے خلاف حکومت کی تائید (۲) نیشنل کانفرنس کے خلاف الزام تراشیوں میں وزارت کی ہمنوائی (۳) گھناؤنا پروپیگنڈا (۴) وزارت کے عیارانہ مظاہروں کے لئے رضاکار بہم کرنا (۵) اس کے ہر ظلم وستم پر "جزاک اللہ" اور "مرحبا" کہنا۔ (۶) افیونیوں کی طرح پینک کی مستی میں اس خوش فہمی کا شکار ہوجانا کہ جابر حکومت ہمارے تعاون سے نیشنل کانفرنس کو ختم کرکے ہمارے لئے میدان خالی کررہی ہے۔ اور جب ہم کوئی مطالبہ کریں گے۔ تو باتیں ہاتھ سے ہمارے سامنے رکھ کر مؤدبانہ اٹینشن ہوکر کھڑی ہوجائیگی۔ یہ سب حرکات اس خودکشی کی مختلف شکلیں ہیں اور میں ندامت کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ حکومت کے جن مقاصد کو مشین گنوں کی گولیاں قیامت تک پورا نہ کرسکتیں۔ وہ تفرقہ کی ادنیٰ سی کوششوں نے پورے کئے۔ اور ان لوگوں کے ہاتھوں سے پورے ہوئے۔ جو حریت کے دعوؤں میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔

عیاری ومکاری عیاری سے عوامی تحریک کا مقابلہ کرنا ڈوگرہ حکومت کا تیسرا حربہ ہے۔ جب وہ دیکھتی ہے کہ اس کا جبروتشدد اور اس کا پھیلایا ہوا تفرقہ دونوں ہتھیار عوام کو ان کے مطالبات سے دست بردار ہوجانے پر مجبور نہیں کرسکتے تو وہ اس تیسرے حربے یعنی عیاری کا استعمال کرتی ہے۔ اس عیاری کی شکلیں مختلف ہیں لیکن اصول ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ "لفظی حد تک مطالبہ تسلیم کرلو مگر اس کو روح سے محروم کردو"۔ جبروتشدد اور تفرقہ کی طرح یہ حربہ بھی پورے پندرہ سال سے استعمال میں آرہا ہے۔ اور حسب ذیل اقدامات اس کے موٹے موٹے نمونے ہیں۔

عیاری کے نمونے (۱) ۱۹۳۱ء کے مختلف کمیشن۔ ان کی رپورٹیں اور پھر ان کی سفارشات پر عمل کے وقت اختیار کردہ طرز عمل عیاریوں کا اولین نمونہ ہے۔ جس کے آئینے میں ڈوگرہ نظام کی شکل دیکھی جاسکتی ہے۔

(۲) بے شمار قربانیوں کے بعد ۱۹۳۴ء میں "عوام کی جماعت" اور پرجا سبھا کے نام

سے قانون ساز اسمبلی لوگوں کو دی گئی۔ مگر ایک ہاتھ سے دیکر دوسرے ہاتھ سے واپس لینے کی غرض سے ۷۵ کے ہاؤس میں ۳۳ عوامی نمائندوں کے مقابلہ میں ۴۲ سرکاری طرفدار بٹھادئیے یعنے عوام کے ۳۳ ووٹوں کو سرکاری ووٹوں میں سے ۳۳ نے ختم کر دیا اور حکومت کی جیب میں نو مہرے بچے رہ گئے۔ اس شاندار "توازن" کے بعد اسمبلی کے اختیارات پر بحث کرنا ہی فضول ہے۔

(۳) اسمبلی کے قیام کی عیاری کا پردہ جب تجربے نے عوام پر چاک کر دیا۔ اور اس کے بعد ہر طرف سے منتخب اکثریت کا مطالبہ ہونے لگا۔ تو عیاری کے ترکش سے دوسرا تیر نکالا گیا۔ دو علاقہ دار، دو جاگیردار، دو ٹھیکیدار ایک پنشنر سات ایسے افراد جو اس دنیا میں، تو کیا۔ دوسرے جنم میں بھی دفتری نظام کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ کرسکیں انہیں "منتخب" میں شامل کر دیا۔ اور ساری دنیا میں ڈھنڈورہ پیٹا گیا کہ کشمیر اسمبلی منتخب اکثریت پر مشتمل ہے۔ ۳۵ سرکاری اور نامزد ممبروں کے مقابلہ میں ۴۰ منتخب ممبر ہیں"۔ اب عوام لاکھ چلائیں کہ یہ عیاری ہے۔ اور جو نئی سات نشستیں اس طرح منتخب قرار دی جارہی ہیں۔ ان پر منتخب ہونے والوں سے تو کوئی براہ راست نامزد ہونے والا ممبر ہی ہزار درجہ بہتر ہے۔ مگر ان کی کوئی سنتا۔ گویا کہنے کو ۱۹۳۹ء میں کشمیر کے عوام کو آئینی اصلاحات کی دوسری قسط بھی مل گئی۔ مگر عملاً وہی صفر ان کے حصہ میں آیا۔

(۴) ۲ ر اکتوبر ۱۹۴۴ء کی ڈیارکی اس نظام کی عیاری کا ایک اور شاندار نمونہ تھا جس کے بل بوتے پر کشمیر کو ہندوستان بھر کی ریاستوں میں ترقی یافتہ ثابت کرنے کے لئے پروپیگنڈے کی مشین بڑے زور سے چلائی گئی۔ مگر جب نیشنل کانفرنس نمائندہ مرزا محمد افضل بیگ نے ان اختیارات اور حقوق کا مطالبہ کیا جو عوامی منسٹر اور ملازم منسٹر کے درمیان فرق اور امتیاز کا موجب ہو سکتے۔ تو عیاری کی نازک کشتی اس

مطالبہ کی چٹان سے ٹکرا کر چور چور ہو گئی۔ اور اس کے علاوہ ایک شرمناک سازش کے بھنور میں ڈبکیاں کھاتے نظر آئے۔ جن کی تھوڑی سی تفصیل اپنی جگہ پر آ جائیگی۔

(۵) کشمیری عوام کو زیبا رکیا گیا کہ تمہارے لیئے پنچائتیں اور دیہات سدھار کمیٹیاں مقرر کی جارہی ہیں۔ بگر عملاً یہ کمیٹیاں دیہات میں تحریک حریت کو دبانے کے لیئے پولیس چوکیوں اور مخبری، رشوت ستانی اور لوٹ مار کے اڈوں کے طور پر استعمال کیجارہی ہیں۔ اور اس عیاری کے اندر جو اور سینکڑوں عیاریاں کارفرما ہیں۔ ان کی تشریح کے لیئے دفتروں کے دفتر کالے کیئے جا سکتے ہیں۔

(۶) میونسپل کمیٹیوں، ٹاؤن ایریا کمیٹیوں اور دوسرے انتخابی اداروں کا جہاں کہیں ڈھونگ رچایا گیا۔ عوام کا نام ہی نام رکھا گیا۔ اختیارات ہمیشہ مطلق العنانیت کے ہاتھ رہے ہے۔

(۷) دوران جنگ میں عوام کو ضروریات زندگی بہم پہنچانے کے لیئے کسی ایک عوامی جماعتوں کے تعاون کو بظاہر قبول کر کے اور اندر سے ان کے خلاف ناپاک محاذ جاری رکھ کر اور راشی ملازموں اور منافع باز ذخیرہ اندوزوں کے محاذ کو تقویت دینے کی جو پالیسی آج تک جاری ہے۔ وہ بھی کوئی ایک عیاری نہیں۔ بلکہ سینکڑوں عیاریوں کا مجموعہ ہے۔

(۸) ۱۲ جولائی ۱۹۴۳ء کو اصلاحاتی کمیشن قائم کرتے ہوئے جو لمبے چوڑے اعلان کیئے گئے۔ ان کو ایک طرف رکھ لیجئے۔ اور اس کمیشن میں جاگیرداروں، اجکداروں، پنشنروں اور سرکاری افسروں کو عوامی نمایندوں کے مقابلہ میں جو عددی فوقیت دی گئی۔ اس کو دوسری طرف رکھئے۔ اور اس کے ساتھ ہی کمیشن کی کارکردگی۔ اور اس کی رپورٹ، اور اس رپورٹ کا انجام ان سب کو بھی ملا لیجئے۔ اور پھر بتائیے کہ اس عیاری کی کوئی مثال دستیاب ہو سکتی ہے؟

(۹) حکومت کشمیر کی عیاریوں کی فہرست یقیناً نامکمل رہے گی۔ اگر شوپیان کے قصبہ

میں "شراب کی بندش" اور "ریاست کے طول وعرض میں بیسک تعلیم کا اجرا" اور آل انڈیا تعلیمی کانفرنس کے اجلاس سرینگر کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ ان عیاریوں سے کانگریس اور گاندھی جی کے نعروں کو اپنا کر سستی شہرت کے علاوہ سیاسی حمایت حاصل کرنا حکومت کشمیر کا اولین مقصود تھا لیکن درخت کو اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اور پھل سب کے سامنے ہے۔

(۱۰) "ترقیات بعد از جنگ" کے نام سے بڑے بڑے دعوے کئے گئے۔ پنجسالہ بجٹ۔ پلیننگ کمیٹی بنائی گئی۔ اور ایک پرائم منسٹر جس نے اس ریاست کو ایک "نمونہ کی ریاست" بنانے کی ڈینگ ہانکی تھی۔ مدتوں اپنی ایک خود ساختہ "زمانہ بعد از جنگ کمیٹی" کے اجلاس منعقد کرتا رہا مگر نتیجہ یہ ہے کہ ایک تنکا تک اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ کیونکہ مقصد صرف عوام کو دھوکہ میں رکھنا اور اپنے حق میں جھوٹا پروپیگنڈا کرانا تھا۔

(۱۱) مہاراجہ سر ہری سنگھ نے سنہ ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس میں جو تقریر کی۔ سنہ ۱۹۳۴ء کے قیام اور اس کے آئین میں ترمیمات کے مواقع پر ۱۱ر فروری سنہ ۱۹۳۹ء اور ۲ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۴ء کو جو اعلان کئے۔ اور مارچ سنہ ۱۹۴۲ء میں اسی مہاراجہ نے کرپس مشن کی آمد پر اخبارات کو جو بیان دیا۔ ان سب کو ایک طرف رکھ لیجئے۔ اور دیکھئے کہ ان میں "حریت پرستی"، "آزادی" کے لئے "تڑپ اور "رائے عامہ کے احترام" کے کس قدر مظاہرے کئے گئے ہیں۔ اور دوسری طرف مہاراجہ کے باقی حریت کُشانہ اقدامات کو چھوڑ کر صرف اس ایک سازش کو سامنے لائیے، جو نیشنل کانفرنس کے اسمبلی گروپ کے لیڈر کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بروئے کار لائی گئی جس کے ذریعہ جہاں ملک کے عوام پر جارحانہ حملہ کیا گیا۔ وہاں کشمیر اسمبلی کو بالائے طاق رکھ کر خود مہاراجہ نے اس سازش میں برابر کی شرکت کی جس کے دستخطوں کے بغیر وہ مکمل نہ ہو سکتی تھی اب ان طریقوں سے مقرر کئے ہوئے کسی شخص کی نسبت دنیا کو یہ بتانا کہ وہ عوامی منسٹر ہے اور کونسل میں عوام کی نمائندگی کرتا ہے۔ شرمناک جھوٹ اور گھناؤنی عیاری نہیں تو اور کیا ہے۔

صرف تین ہتھیار

غرضیکہ "جبر و تشدد"، "تفرقہ بازی"، "عیاری اور مکاری" یہ ہیں وہ تین حربے جن کے سہارے ڈوگرہ نظام تحریک حریت کشمیر کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اور ۱۹۳۱ء سے ہی نہیں بلکہ ۱۹۲۴ء سے ہی یہ تینوں حربے دوش بدوش کارفرما چلے آئے ہیں۔ اور تاریخ کا طالب علم جب کشمیر میں بیسویں صدی کے دوسرے ربع (۱/۴) کے واقعات کا مطالعہ کرے گا۔ تو اسے قدم قدم پر اس ظالمانہ نظام کے جبر و تشدد، تفرقہ اندازی اور عیاری اور مکاری سے دو چار ہونا پڑے گا۔

"کاکی" حملہ اور تین ہتھیار

قائد اعظم شیخ محمد عبداللہ اور ۱۹۳۹ء سے پہلے کی مسلم کانفرنس اور موجودہ نیشنل کانفرنس نے عوامی ترجمانی کے وقت جن مصائب کے طوفان کا مقابلہ کیا۔ اور تحریک آزادی کو اپنے جہد للبقاء کا فرض انجام دینے کے وقت بار بار مخالف طاقتوں کے جن ہتھیاروں کا سامنا کرنا پڑا وہ اسی جبر و تشدد، تفرقہ بازی اور عیاری و مکاری کے تین ہتھیار تھے۔ اور کاک وزارت نے ۲۰ مئی ۱۹۴۶ء سے عوامی تحریک پر جو آخری حملہ شروع کیا ہے۔ اس میں تو یہ تینوں ہتھیار اس فیاضی سے برتے گئے کہ پچھلا تمام ریکارڈ مات ہو کر رہ گیا ہے اس کاکی حملہ کے جبر و تشدد اور تفرقہ بازی کی مثالیں کوچہ و بازار میں ہر طرف رسوا ہو چکی ہیں لیکن اس کی عیاریوں کا نادر نمونہ دیکھنا ہو۔ تو کرائے کے وہ ٹٹو ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ جو ۱۹۔ اور ۲۰ جون کو "گو بیک جواہر لعل" کا نعرہ لگانے کے لئے کوہالہ پل کے کنارے لے جا کر کھڑے کئے گئے۔ اور دنیا کی آنکھوں میں مٹی جھونکتے ہوئے کہا گیا تھا کہ یہ کشمیر کے عوام ہیں۔ جو نہیں چاہتے کہ جواہر لال یہاں آئے۔

حق کا طریق کار

ایسے ماحول میں تحریک آزادی کی رہنمائی کرنے والی جماعت اپنے فرائض کو صحیح طریقہ سے صرف اسی صورت میں ادا کر سکتی تھی کہ (۱) وہ عوام کو جبر و تشدد کے مقابلے میں ایثار و قربانی، ہمت و بہادری، ثبات

و صبر اور عزم و استقلال کی تعلیم دے۔ (۲) تفرقہ بازی کا مقابلہ کرنے کے لئے انسانی اخوت و ہمدردی، حقوق شہریت کی مساوات، فرقہ دارانہ اتفاق و رواداری معاشیاتی و اقتصادی امور میں تعاون و اشتراک کی تبلیغ کرے۔ اور عوام کو بتائے کہ متحدہ کوششیں ہی کامیابی کا واحد ذریعہ ہیں۔ اور (۳) حکومت کی عیاریوں اور مکاریوں کا پردہ قدم قدم پر چاک کر کے عوام کو اس جال سے آزاد کرے۔

کامیاب قیادت

آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس نے اپنے قابل قائد شیر کشمیر کی رہنمائی میں ان تینوں فرائض کو پوری سرگرمی سے انجام دیا۔ آج اگر اس ریاست کا عام انسان ہر ایک تشدد کو خوشی سے برداشت کرنا موجب فخر سمجھتا ہے۔ اور ایک ان پڑھ محنت کش کشمیری بھی فرقہ دارانہ اور اختلافی نعروں کے پیچھے چھپے ہوئے مذموم ارادوں کو پہلی نظر میں ہی تاڑ لیتا ہے اور ہر شخص حکومت کی پیچیدہ سے پیچیدہ عیاری کی اصلیت کو سمجھنے اور اس کو طشت از بام کر دینے کی پوری قابلیت کا ثبوت دے رہا ہے۔ تو یہ سب کچھ نیشنل کانفرنس کی ان تھک محنت کا پہلا ثمرہ ہے۔

اول آزادی آخر آزادی

نیشنل کانفرنس نے عوام کی جو سیاسی تربیت کی۔ اس کے دو شعبے ہیں۔ اولین شعبہ نصب العین اور منزل مقصود کا تعین ہے۔ اور اس تک پہنچنے کا پروگرام ہے۔ دوسرا شعبہ اس راستہ کی مذکورہ صدر رکاوٹوں کو راستہ سے ہٹا کر آگے بڑھنے کے طریقے ہیں۔ جہاں تک نصب العین کا تعلق ہے۔ نیشنل کانفرنس کا نصب العین ابتدا سے لیکر آج تک ایک ہی رہا ہے۔ اور ایک ہی رہیگا۔ اس میں نہ کوئی تبدیلی ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔ اور وہ ہے آزادی اور بس۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں جب پہلے بیداری کی ننھی سی آواز بلند ہوئی۔ تو آزادی کے لئے بلند ہوئی۔ اور آج سولہویں سال میں جب کشمیریوں کا نعرہ اتنا

اونچا ہو چکا ہے کہ ہندوستان سے باہر دیگر ممالک میں بھی اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ تو اس وقت بھی صرف "آزادی" مطلوب ہے۔ کسی عبادت گاہ کی آزادی ہو۔ یا طریقِ عبادت کی۔ پلیٹ فارم سے تقریر کی آزادی ہو یا اخبار میں تحریر کی جنت کا استحصال کرنے والوں کے پنجے سے نجات کی آزادی ہو یا حقوق شہریت چھین لینے والے نظام کی گرفت سے مذہب و ثقافت (کلچر) کی آزادی ہو یا اقتصادیات و سیاست کی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور ان میں سے کسی ایک آزادی کو پہلے دن حاصل کر کے دوسرے دن دوسرے کا مطالبہ کرنا یا ایک کے حصول کے بغیر ہی دوسرے کا طالب ہونا پہلے مطالبے کا منافی نہیں۔ بلکہ اس کی تائید ہے۔ کشمیر کی تحریک حریت کا واحد مطالبہ بھی "آزادی" رہا ہے۔ جب ۱۹۳۱ء میں بند کی ہوئی مسجدوں کے دروازے نمازیوں پر کھول دینے کے لئے یہ تحریک میدان میں تھی۔ تب بھی "آزادی" کا ہی مطالبہ تھا عوام کے لئے جلسہ، جلوس، اجتماع اور پریس کے استعمال کا حق مانگ رہے تھے۔ تو بھی آزادی کا مطالبہ تھا۔ اور مکمل ذمہ دار نظام حکومت کے ساتھ ساتھ آج جبکہ اس تحریک کا انتہائی مطالبہ "آخری اقتدار اختیارات کا مالک خود راجہ کشمیر کے بدلے اس ملک کے ۴۰ لاکھ عوام کو" بنانا ہے۔ تب بھی وہی آزادی اور صرف آزادی کا مطالبہ ہے جس کو دہرایا جا رہا ہے۔

یہی مطالبہ آزادی۔ یا عوام کا نصب العین اور منزل مقصود ہے۔ جس کی واضح شکل "نیا کشمیر" اور "کوئٹ کشمیر" کے آئینہ میں نظر آتی ہے۔ اور "بیع نامہ امرتسر کو پھاڑ دو" کے نعرے نے عملاً جس کی تفصیل و تشریح کافی حد تک کر دی ہے۔

آزادی کے حدود اربعہ

تحریک کی نسبت نیشنل کانفرنس کا یہ دعویٰ کہ یہ مقصد آج ۱۹۴۶ء میں بھی وہی ہے جس کو یہ تحریک ۱۹۳۱ء میں لیکر اٹھی تھی۔ اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ نیشنل کانفرنس اس وقت مطالبہ

آزادی کو جو آخری شکل دے چکی ہے۔ یہاں اس کی وضاحت کر دی جائے۔ اور کھلے لفظوں میں بتا دیا جائے کہ اس آزادی کے حدود اربعہ کیا ہیں۔ جس کی دھن میں آج نیشنل کانفرنس سر دھڑ کی بازی لگا چکی ہے۔ اور جس کا مطالبہ کرنا مجھے اور سینکڑوں دوسرے کشمیریوں کو ان دنوں مجرم قرار دیکر کشاں کشاں عدالتوں کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔

پانچ نکات

ذیل کے پانچ سوالات کو ذہن میں رکھ کر نیشنل کانفرنس کی دو تحریری دستاویزات "نیا کشمیر" اور "کوئٹ کشمیر" کا مطالعہ کیا جائے تو نیشنل کانفرنس کے مطالبہ کی موجودہ پوزیشن صحیح طور پر سمجھ میں آسکتی ہے۔

(۱) نیشنل کانفرنس نے آیندہ کے لئے جو نظام تجویز کیا ہے۔ اس میں باشندگان جموں و کشمیر کے انسانی اور شہری حقوق کیا ہوں گے؟

(۲) مطلوبہ جمہوری نظام کی قانون ساز مجلس کن عناصر سے مرکب ہوگی۔ اس کی ساخت و پرداخت میں عوام کس طرح حصہ لینگے۔ اور اس کا دائرۂ اختیارات کہاں تک ہوگا؟

(۳) مطلوبہ جمہوری نظام کی قوت نافذہ (ایگزیکیٹو) کی بناوٹ اور اختیارات کی تفصیل کیا ہوگی؟

(۴) اس مطلوبہ جمہوری نظام کی عدلیہ کی ساخت اور اس کا آزادانہ دائرۂ عمل؟

(۵) اس جمہوری نظام میں عوام کے لئے اقتصادی، معاشرتی، تعلیمی اور تہذیبی ترقیات کے منصوبے کیا ہوں گے؟

نیا کشمیر پر ایک نظر

پہلے سوال کا جواب "نیا کشمیر" کی دفعہ ۱ سے ۱۸ تک پھیلا ہوا ہے۔ اور ان دفعات میں انسانی حقوق شہریت کے لئے وہ تمام تصورات بنیاد بنائے گئے ہیں۔ جو زمانہ جدید کے سیاسی تجربوں اور علمی تحقیقات کا نچوڑ ہیں۔ ان دفعات کی رُو سے کشمیر کے ہر ایک متنفس کے لئے وطنیت کی بنا پر ایک جیسے حقوق تسلیم کئے گئے ہیں۔ اور اس پر ایک ہی جیسے فرائض عائد کر کے اس کو

تمام خطروں، خوفوں اور ضرورتوں سے محفوظ رکھنے اور اس پر اس کی ہمت اور اہلیت کے مطابق ترقیات کے تمام دروازے کھلے رکھنے کی ذمہ داری نظام حکومت پر ڈالی گئی ہے۔ دوسرے سوال کا جواب "نیا کشمیر" کی دفعہ ۱۹ سے لیکر ۲۳ تک اور ۲۸ سے لیکر ۳۲ تک ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ جن کی رُو سے کشمیر کی تجویز کردہ قومی اسمبلی کامل جمہوری اختیارات سے مسلح ہوگی۔ اور اس کا نظام انتخاب ایسا وسیع ہوگا کہ ہر ایک بالغ زن و مرد پوری آزادی سے اپنے آپ کو اس کا ممبر بننے کے لئے پیش کر سکے گا۔ اور دوسروں کو ممبر بنانے میں حصہ لے سکے گا۔ انہی بنیادوں پر اسمبلی کے علاوہ دوسرے انتخابی اداروں بلدیات اضلاعی مجالس اور دوسری چھوٹی مجلسوں کا نظام پورے سائنٹفک طریقے پر "نیا کشمیر" کی دفعات ۴۵ تا ۴۷ میں بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے سوال کا جواب آپ یوں تو "نیا کشمیر" کی دفعات ۲۴ تا ۲۷ میں دیکھ سکتے ہیں لیکن "نیا کشمیر" کی دفعہ ۲۷ تشریح طلب تھی۔ اور "کونسٹ کشمیر" اسی دفعہ کی تشریح و وضاحت کا ہی دوسرا نام ہے۔ "کونسٹ کشمیر" کو "نیا کشمیر" کی دفعہ ۲۷ کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے سارا ابہام رفع ہو جاتا ہے۔

مندرجہ چوتھے سوال کا جواب "نیا کشمیر" کی دفعات ۳۳ تا ۴۰ تک پھیلا ہوا ملیگا۔ جس کی رو سے جموں و کشمیر کے لوگوں کے لئے عدل و انصاف کا ایک ایسا کامل نظام تجویز کیا گیا ہے۔ جو اپنی ساخت میں جمہور کا نمایندہ اور اپنے فیصلوں میں کامل غیر جانبدار خود مختار اور آزاد ہوگا۔

اقتصادی منصوبہ

نیشنل کانفرنس کا تجویز کردہ اقتصادی اور معاشرتی منصوبہ جو "نیا کشمیر" کی دفعہ ۵۰ کے تحت اس کے آئینی منصوبے کا ایک حصہ ہے۔ آئندہ اقتصادی، معاشرتی، تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی تصورات کا بنیادی خاکہ پیش کر رہا ہے۔ اس خاکے میں رنگ بھرنا اور ان امور کے لئے مفصل سکیمیں مرتب

کرنا ان کمیشنوں کا کام ہوگا۔ جو اس منصوبے کے مطابق جمہوری حکومت مقرر کریگی۔ اس منصوبے میں کسانوں کا حقوق، مزدوروں کا حقوق نامہ، تعلیمی چارٹر، خواتین کا حقوق نامہ اسی قسم کے دوسرے نقشوں کا سرسری مطالعہ ہر شخص پر واضح کر سکتا ہے کہ نیشنل کانفرنس نے اس ریاست کی آیندہ اقتصادیات، معاشرت، تعلیم، صحت، تہذیب اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی کے لئے جو نظام تجویز کئے ہیں۔ وہ کتنے مکمل ہیں۔

دفعہ ۲۷ کی ضروری وضاحت

جہاں تک اوپر کے پانچ سوالوں میں سے پہلے، دوسرے چوتھے اور پانچویں کا تعلق ہے۔ آل جموں وکشمیر نیشنل کانفرنس کا سیاسی واقتصادی منصوبہ "نیا کشمیر" جو کانفرنس کے سالانہ اجلاس ستمبر سنہ ۱۹۴۴ء کے فیصلہ کے مطابق تسلیم شدہ نصب العین ہے۔ اس میں یہ سوالات کسی تشریح کے محتاج نہ تھے۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے تیسرا سوال جو آیندہ نظام کی قوتِ نافذہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اور جس میں ذمہ دار نظام حکومت کی مجلس انتظامیہ کی ذمہ داری تو قومی اسمبلی کے سامنے تھی لیکن اس مجلس کے قیام کی منظوری ایک حد تک حکمران کے استرضاء پر منحصر محسوس ہوتی تھی۔ "کوئٹ کشمیر" نے لفظ "حکمران" کی آخری اور مکمل وضاحت کر دی۔ بالفاظ مختصر یوں سمجھئے کہ دفعہ ۲۳ میں اسمبلی کو جو اختیارات سونپے گئے تھے۔ ان پر "حکمران" کا کنٹرول مانا گیا تھا۔ کوئٹ کشمیر" نے ایک نئے سوال کا جواب دیا۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ حکمران سے مراد کیا ہے؟ "نیا کشمیر" نے اگرچہ کہیں صریحاً نہیں کہا تھا لیکن سیاق وسباق سے یہ واضح تھا کہ مہاراجہ ہری سنگھ یا اس کا جانشین اس مطلوبہ حکومت کے دوران میں حکمران کے درجہ پر تب ہی قائم رہ سکتا ہے جب اس کو عوام کی رضامندی، تائید اور منظوری حاصل ہو۔ "کوئٹ کشمیر" نے اس شرط کو کھلے لفظوں میں بیان کیا۔ اور "نیا کشمیر" کی دفعات ۲۲، ۲۳، ۲۷ اور ۹ہم وغیرہ میں جہاں کہیں بھی "ہز ہائینس" اور "حکمران" کے الفاظ آتے ہیں۔ ان کے ساتھ اب یہ ایک

وضاحتی شرط لازمی ہے کہ حکمران وہی ہوگا۔ جو عوام کی اعلان کردہ تسلیم و رضا سے اس منصوبہ پر فائز ہو۔

کوئٹ کشمیر کے بعد

نیشنل کانفرنس کے مطالبہ آزادی کی وہی شکل و صورت جس کے لئے وہ اس وقت ابتلائی دور سے گذر رہی ہے۔ اور اس کو آپ اگر مزید وضاحت کا محتاج تصور کریں۔ تو نیشنل کانفرنس کی طرف سے اس کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) نیشنل کانفرنس مطالبہ کرتی ہے کہ تاج برطانیہ کو ریاستی ہندوستان پر جو اقتدار اعلیٰ حاصل تھا۔ اور جو کیبنٹ مشن کے اعلانات ۱۶، ۲۰، ۲۲ مئی ۱۹۴۶ء کے رو سے آئندہ تاج مذکور کو حاصل نہ رہے گا۔ تاج برطانیہ کی دستبرداری کے بعد یہ اقتدار ریاستوں میں بسنے والے عوام کی طرف منتقل ہو جانا چاہیئے۔ اور ریاستی حکمران جس طرح آج تک اس اقتدار سے محروم چلے آتے تھے۔ آئندہ بھی محروم رہیں۔ اور جس طرح ان کی تخت نشینی آج تک تاج برطانیہ کے تابع مرضی تھی۔ اسی طرح آئندہ ریاستی عوام کے تابع مرضی رہے۔

(۲) اس اقتدار کے عوام کی طرف منتقل ہونے کی علامت کے طور پر ریاستی باشندوں کو موقع دیا جائے۔ کہ وہ اپنے اپنے حکمرانوں کو آئندہ قائم رکھنے یا نہ رکھنے کی نسبت عام رائے اندازی سے اپنے قومی فیصلے یعنی حکمران کی تقرری یا اس کے خلاف اپنی رضا و تسلیم کا اظہار کریں۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی حکمرانی کی نسبت عوامی فیصلہ لینے کے لئے نیشنل کانفرنس اس ریاست کی چالیس لاکھ انسانوں کے لئے یہی حق طلب کر رہی ہے۔ جس کو وہ عوامی اقتدار اعلیٰ اور آخری اختیارات کے نام سے پکارتی ہے۔

(۳) نیشنل کانفرنس مطالبہ کرتی ہے کہ اگر رائے عامہ کی اکثریت کا فیصلہ مہاراجہ ہری سنگھ کو حکمران تسلیم کرے۔ تو وہ مطلق العنانہ اختیارات سے دستبردار ہو کر صرف ان اختیارات کا استعمال کرے۔ جو جمہوری نظام کی قومی اسمبلی آئینی حکمران کے لئے آئندہ آئین میں مقرر

کرے گی۔

(۴) اگر رائے عامہ کی اکثریت کا فیصلہ یہ ہو کہ آئندہ ریاست جموں و کشمیر کا سرے سے کوئی حکمران ہونا ہی نہیں چاہیئے۔ تو اس صورت میں رائے عامہ کے فیصلے کے سامنے مہاراجہ ہری سنگھ کو پرامن طریقہ سے سر جھکا دینا چاہیئے۔ اور گدی سے دستبردار ہو کر عوام کو یہ موقعہ دینا چاہیئے کہ وہ ہر بالغ کے مساوی ووٹ سے ایک آئین ساز جماعت بنا کر اپنی آئندہ قسمت، ملک کے اندرونی نظام اور بیرونی تعلقات و تحفظ کا خود فیصلہ کرے۔ اور کشمیر میں ایک ایسی جمہوری حکومت قائم کرے۔ جو اس خطے کو ہندوستان کے دوش بدوش ترقی کے راستہ پر ڈال سکے۔

(۵) ریاستوں کی پچھلی روایات اور معاہدات اور سندات سے حکمرانوں کو جو حقوق حاصل ہیں۔ ان کے مرتب کرنے میں ریاستی باشندوں کی مرضی کا کوئی دخل نہ تھا۔ بالخصوص "بیع نامہ امرتسر" جو کشمیر کے لوگوں کی مرضی اور علم کے بغیر مرتب ہوا ہے۔ جس میں شرمناک توہین و تمسخر کا لین دین عمل میں لایا گیا ہے۔ چونکہ ان معاہدات اور سندات اور بیعناموں پر دستخط کرنے والی طاقت (سرکار برطانیہ) اپنے قبضہ میں رکھے ہوئے اقتدار اور اختیارات سے دستبردار ہو چکی ہے۔ اور عوام کے نقطہ نظر سے یہ اقتدار اور اختیارات عوام کو منتقل ہو چکے ہیں۔ لہذا تمام سندات و معاہدات بالعموم اور "بیعنامہ امرتسر" بالخصوص ختم ہو جانے ضروری ہیں۔ آئندہ ان کو کسی تقدیس کا مستحق تصور نہ کیا جائے۔ اور ان کی بنا پر کسی چھوٹے یا بڑے حق کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ یہ وہ پوزیشن ہے جس پر اس وقت نیشنل کانفرنس کھڑی ہے۔ اسی پوزیشن کو "کوئٹ کشمیر" دستاویز کے ذریعہ برطانیہ کیبنٹ مشن کے سامنے رکھا گیا تھا۔ اور "کشمیر چھوڑ دو" اور "بیعنامہ امرتسر توڑ دو" کے دونوں نعروں کے ذریعہ پچھلے پانچ مہینے سے کشمیر کے شہر و دیہات میں عوام جس جذبہ اور تمنا کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ نیشنل کانفرنس

کے اوپر بیان کی ہوئی پوزیشن کی ہی تائید اور حمایت کی مخصوص شکل ہے۔

نعرہ آزادی کا موزون وقت

نیشنل کانفرنس اپنے مطالبات کو ۱۹۴۴ء میں "نیا کشمیر" کے ذریعہ جو شکل دے چکی ہے۔ "کوئٹ کشمیر" کے ذریعہ اس شکل کو تکمیل تک پہنچانے اور مطالبہ آزادی کے نئے طریقہ کو پیش کرنے کا یہ موزون ترین وقت تھا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں۔ قائد اعظم شیخ محمد عبداللہ موزون وقت کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ انہوں نے "کشمیر چھوڑ دو" اور "بیعنامہ امرتسر توڑ دو" کا نعرہ بھی عین نفسیاتی لمحات میں لگایا۔

انگریزی تسلط کا خاتمہ

ہندوستان تاریخ کے اس مرحلے سے گذر رہا ہے کہ اس پر ۲۵۰ سال تک حکومت کرنے کے بعد انگریزی امپیریلزم نے اپنا تسلط اٹھا لینے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ اور اس آمادگی کو عملی شکل دینے کے لیے اس وقت آئین ساز اسمبلی، درمیانی دور کی قومی حکومت اور کانگریس اور لیگ میں سمجھوتہ کی شکل میں جدوجہد کا بازار گرم ہے۔ انگریز کی حکومت ہندوستان کے جن حصوں پر براہ راست تھی۔ اس کے سامنے حصول آزادی کے لئے راستے میں اب کوئی دیوار کھڑی نہیں رہی جو اقتدار انگریز کے پاس تھا۔ وہ ہندوستانی عوام کی طرف منتقل ہوتا جا رہا ہے۔ اور عنقریب مکمل طور سے منتقل ہو جائیگا۔ لیکن ہندوستان کا ایک تہائی رقبہ جس کو ریاستی ہندوستان کہا جاتا ہے۔ اور جس میں نو کروڑ تیئس لاکھ انسان آباد ہیں۔ اس پر انگریز کی حکومت بالواسطہ تھی۔ اس کی آزادی کا سوال پیچیدہ ہو گیا ہے۔ انگریز جب اس حصے پر سے اپنا اقتدار ہٹاتا ہے۔ تو یہاں عوام کے مقابلہ میں اقتدار و اختیار اعلیٰ کی دعویدار ایک اور پارٹی سامنے آجاتی ہے۔ اور وہ مہاراجوں اور نوابوں کی پارٹی ہے۔ جو یہ چاہتی ہے کہ ریاستی ہندوستان پر سے انگریز کا تسلط اٹھ جانے کے بعد آخری

اختیار اور اعلیٰ اقتدار کو جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ ہتھیاروں کے بل بوتے پر وہ اپنے اندر منتقل کرے۔ اور اس کے بالمقابل نوکروڑ تینتیس لاکھ باشندے یہ چاہتے ہیں کہ یہ اقتدار اور اختیار جو درحقیقت عوامی دولت اور جمہوری حق ہے۔ ریاستوں کی پوری نوکروڑ تینتیس لاکھ آبادی کی طرف منتقل ہو۔ تاکہ اس کو استعمال کرکے یہ نوکروڑ تینتیس لاکھ ہندوستانی باقی اکتیس کروڑ ہندوستانیوں کے برابر آزاد ہوسکیں۔ اور ترقی کے میدان میں ان کے دوش بدوش چل سکیں۔ یہ ہے مفاد کی وہ کشمکش جو والیانِ ریاست اور باشندگانِ ریاست کو اس وقت دو مقابل اور متحارب جماعتوں میں تقسیم کر رہی ہے۔

اقتدار اعلیٰ کا مستحق بالفاظ دیگر اقتدار اور اختیارات اعلیٰ ایک ایسی چیز ہے جو آج سے قبل نہ تو ۵۸۴ والیان ریاست کو حاصل تھی۔ اور نہ ان کے نوکروڑ تینتیس لاکھ رعایا کو۔ بلکہ ایک تیسری طاقت کے پاس تھی۔ اب جبکہ تیسری طاقت اس سے دستبردار ہوگئی ہے۔ تو والیان ریاست اور ان کی رعایا کے درمیان جہد للبقا کے قدرتی اصول کے مطابق کشمکش پیدا ہوگئی ہے۔ اب اس کشمکش کے خاتمہ ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو کوئی ثالث ان دو میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ دیدے۔ یا بالمقابل پارٹیاں قوت آزمائی سے فیصلہ کرلیں۔ کوئی ایسی ثالث پارٹی جو مسلمہ فریقین ہو۔ فی الحال موجود نہیں۔ تاج برطانیہ اس مرحلہ پر اس سوال کی نسبت خاموش ہے۔ اگر کچھ کہنا چاہے بھی۔ تو اغلباً اس کا فیصلہ والیان ریاست کے حق میں ہی ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ ریاستی عوام اپنے خلاف اس کے فیصلہ کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ ہندوستان کی بڑی جمہوری جماعتوں کا فیصلہ جو اصولاً عوام کے حق میں ہونا چاہیئے۔ والیان ریاست کو منظور نہیں ہوگا۔ ایسی حالت میں ایک اور صورت باقی رہ گئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ عوام اپنے اس حق کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کے لئے میدان میں نکلیں۔ اور اقتدار اعلیٰ

حاصل کرکے ہی دم لیں۔ اور اس جدوجہد کے لئے موزون ترین وقت موجودہ وقت ہے۔ جبکہ تمام چیزیں پگھلے ہوئے مواد کی طرح ہیں۔ اور تنازعہ فیہ حق نے ابھی کوئی ایسا سانچہ اختیار نہیں کیا۔ جو مد مقابل پارٹی کا پلہ بھاری کر دینے والا ہو۔

نیشنل کانفرنس کی مساعی جمیلہ

تاکہ یہ موزون وقت ہاتھ سے نہ چلا جائے۔ قائد اعظم شیخ محمد عبداللہ نے کیبنٹ مشن کی آمد پر عوام کے اسی نئے مطالبہ کو اس محضر نامہ کی شکل میں مرتب کر کے مشن کو پیش کیا۔ جو کوئٹ کشمیر کے نام سے موسوم ہو چکا ہے۔ اس سے قبل ایوان شہزادگان کی طرف سے اعلان کردہ عوامی حقوق کے نام نہاد چارٹر اور وزیر اعظم برطانیہ کی تقریر پر تنقید کرتے ہوئے نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے جہاں معاہدات، اسندات، وغیرہ کی تقدیس سے انکار کیا تھا۔ وہاں یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ ہندوستان کو آزادی دینے کا ایسا طریقہ جو ریاستی اور غیر ریاستی ہندوستانیوں کے درمیان امتیاز کی مصنوعی دیواروں کو باقی رکھے۔ اور ریاستی حدود میں بسنے والے لوگوں کو آزادی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے رہنے پر مجبور کرے۔ وہ ہمارے لئے قابل قبول نہ ہوگا۔ اور ہم اس کے خلاف آخری دم تک لڑینگے ورکنگ کمیٹی کے یہی فیصلے تھے۔ جو گذشتہ مارچ کے مہینے میں کئے گئے۔ اور جن کی روشنی میں قائد اعظم شیخ محمد عبداللہ نے کوئٹ کشمیر کا محضر نامہ مرتب کیا۔

گیارہ ماہ سے حملہ کی تیاریاں

ایک جانب جب آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس ان اصولی امور کے لئے آئینی جدوجہد میں معروف تھی۔ تو دوسری جانب ریاست کی غیر ذمہ دار حکومت کانفرنس پر حملہ کرنے اور تحریک آزادی کو کچل دینے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ اور جیسا کہ پنڈت رامچند کاک وزیر اعظم نے ایک اخباری نمائندہ کے ساتھ اپنی ۲۰ مئی ۱۹۴۶ء والی گفتگو میں اعتراف کیا کہ نیشنل

کانفرنس کو کچلنے کی سازش کا جال پورے گیارہ مہینے پہلے سے یعنی جس روز مسٹر کاک نے وزارت عظمےٰ کا چارج لیا۔ اسی روز سے بچھا دیا گیا تھا۔ اس غرض کے لئے ۱۹۴۶ء کے ابتدائی ایام سے ہی سرگرم تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ مثلاً پولیس کے بڑے افسروں میں خصوصی تغیرات، گرگیزن پولیس کی بھرتی، اور بعض فوجی یونیٹوں کو خصوصیت سے واپس بلانا اسی تیاری کے حصے تھے۔ عوامی آزادی کا آشیانہ تعمیر کرنے کے لئے نیشنل کانفرنس جن نادر و نایاب تنکوں کو جمع کر رہی تھی۔ ڈوگرہ راج کے ظلم و ستم کی بجلیاں انہیں جلا کر راکھ کر دینے کی تمنا میں پورے گیارہ ماہ سے تڑپ رہی تھیں۔ خاص کر وزیر اعظم کاک اپنی وزارت کے روز اول سے اس امر کے لئے بے تاب تھا کہ وہ نیشنل کانفرنس کے خلاف یلغار کرے لیکن اس کو کوئی بہانہ نہ ملتا تھا۔

کاک وزارت کی بے تابیاں

بعض دوسری تنظیموں کے ساتھ نیشنل کانفرنس کی جانب سے مشترک محاذ کی بات چیت کرنے نے اس بے تابی کو انتہا تک پہنچا دیا۔ اور کاک وزارت کو محسوس ہونے لگا کہ اگر کانفرنس پر حملہ بولنے میں مزید تاخیر کی گئی۔ تو نیشنل کانفرنس اپنے نئے مطالبوں کے حق میں ریاست کے اندر اور باہر رائے عامہ کو بیدار کرنے میں اس حد تک کامیاب ہو جائے گی کہ اس پر ہاتھ ڈالنا اور اس کا گلا دبانا ناممکن ہو جائیگا۔ اس لئے اس نے کانفرنس کو ادھر سے مشتعل کرنے کی کوشش شروع کی۔ اس نے کانفرنس کے نمایندہ عوامی وزیر مرزا محمد افضل بیگ کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا۔ مسٹر کاک کا خیال تھا کہ نیشنل کانفرنس پھر گرفتاریاں شروع کرا دیگی۔ اور میں اس پر آسانی سے قابو پالوں گا۔ مگر اس کی یہ امید پوری نہ ہوئی۔ تو اس نے نیشنل کانفرنس کی اسمبلی پارٹی کے سادہ لوح لیڈر کو صید زبون سمجھ کر اپنے پھندے میں پھنسا لیا۔ اور ایک ایسی ناپاک اور گندی سازش میں خود مہاراجہ ہری سنگھ کو بھی شریک کر کے دستخط لے لئے۔

جس نے نہ صرف مہاراجہ ہری سنگھ کا وقار ختم کر دیا۔ بلکہ اس پر اگر عوام کا تھوڑا بہت اعتماد تھا اس کا بھی صفایا کر دیا۔ اور اس کے انصاف اور غیر جانبداری پر ایک ایسا دھبہ لگایا جس کو دنیا کے کسی پانی سے دھویا نہیں جا سکتا۔ وزیر اعظم کا خیال تھا کہ اس سازش کے بعد نیشنل کانفرنس کا مشتعل ہو کر جیل چلا جانا یقینی ہے۔ اور اس طرح سیاسی میدان میرے منصوبوں کے لئے صاف ہو جائے گا۔ مگر نیشنل کانفرنس یہ چوٹ کھا کر بھی اپنے مقصد پر سنجیدگی سے متوجہ رہی۔ اور اپنی نئی پوزیشن کی شکل و صورت دینے، عوام کو نئے حالات سے آگاہ کرنے اور دوسری تنظیموں کو جو متحدہ مقاصد میں متفق ہو سکتی تھیں مشترکہ محاذ قائم کرنے کی دعوت دینے میں مصروف رہی۔ اس صورت حالات نے وزیر اعظم کو مایوس کر دیا۔ اور وہ نیشنل کانفرنس کو مشتعل کرنے میں ناکام رہ کر خود مشتعل ہو گیا۔ اور اس اشتعال کے دائرے میں آ کر اس نے ۲۰ مئی ۴۶ء سے پہلے ہی اپنی اس سکیم کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ جو گیارہ مہینہ سے تیار کر رکھی تھی۔ اور شاید جس پر ہر روز نیند سے پہلے نظر ثانی کر لیا کرتا تھا۔

وزیر اعظم کی سکیم

مسٹر کاک کی غرض پرستانہ سکیم جیسا کہ بعد کے واقعات نے بتلایا۔ یہ تھی (۱) کہ ریاست کے سیاسی میدان کو اپنی تمناؤں کی جولانگاہ بنانے کے لئے آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کے صدر شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ سے لیکر ورکنگ کمیٹی کے ارکان، جنرل کونسل کے ممبروں، اور ضلعوں، تحصیلوں اور حلقوں کے سرگرم عہدیداروں کو بیک وقت گرفتار کر کے جیلوں میں بھر دیا جائے۔

(۲) ملک کے طول و عرض میں ڈیفنس رولز اور دفعہ ۲۴ کے تحت اجتماعات کی آزادی ختم کر دی جائے۔ اور عوامی بیداری پر قابو پانے کے لئے ہر محکمے کے عام افسروں کو مجسٹریٹی اور انتظامی اختیارات دے دئے جائیں۔ اور تشدد کو بے لگام چھوڑ دیا جائے۔

(۳) جہاں کہیں عوام کی طرف سے احتجاج کا خطرہ ہو۔ وہاں فوج اور پولیس کے

ذریعہ تشدد مار پیٹ، قتل و غارت کے بے پناہ مظاہرے کر کے عوام کے دلوں پر اسی قسم کا خوف و ہراس اور دہشت وہیبت بٹھا دی جائے جیسا کہ ۱۹۳۱ء سے قبل بیٹھی ہوئی تھی۔

(۴) نیشنل کانفرنس کے پریس کو ختم کر کے باقی اخبارات کو اپنے ڈھب پر لا کر اپنی حمایت اور کانفرنس کی مخالفت کے ذریعہ ایک نئی فضا پیدا کی جائے جو اپنے منصوبوں کے لئے سازگار ہو۔

(۵) جب نیشنل کانفرنس کو ختم کرنے سے رائے عامہ کی مؤثر نگہ کا خطرہ دور ہو جائے تو جاگیردار وغیرہ رجعت پسندوں اور جی حضوری عناصر کو اسمبلی کے انتخابات میں کامیاب کرا کے ان میں عوامی وزیروں کے نام پر اپنے ڈھب کے چند حاشیہ بردار اپنے اردگرد جمع کر کے اپنی وزارت عظمیٰ کو دیوان کی صورت میں تبدیل کیا جائے۔ اور نئی بوتلوں میں پرانی شراب کے مزے لوٹے جائیں۔

باطل کو ذلت بخش ناکامی

یہ ہے وزیر اعظم کاک کی سکیم کا خلاصہ اور اس نے اس پر پچھلے پانچ مہینوں سے عمل شروع کر رکھا ہے۔ رہا یہ امر کہ وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ اور کیا جموں و کشمیر کا دیوان بن جانے کے خواب کی تعبیر اس کے منشا کے مطابق نکلے گی یا نہیں ــــ اس کا جواب آئندہ واقعات ہی دیں گے ــــ فی الحال میں اس موقعہ پر صرف اس قدر وضاحت کرنا کافی سمجھتا ہوں کہ مسٹر کاک اپنی شیخ چلیانہ سکیم کے پہلے چار حصوں پر سختی سے عمل کرنے کے باوجود نیشنل کانفرنس کو ملیا میٹ کر ڈالنے کے مقصد میں ناکام رہا ہے۔ اس نے قائد اعظم شیر کشمیر اور ۳۵۰ سے زائد ممبر آور دہ رہنماؤں اور کارکنوں کو پہلی فہرست کے مطابق ایک رات کے اندر اندر گرفتار کرنے کا مظاہرہ بھی کیا۔ وادی کشمیر کو سرزمین بے آئین بنا کر عوام کو لوٹ مار، گولی، لاٹھی اور تمام قسم کے تشددات کا تختہ مشق بھی بنایا۔ خانقاہوں کے اندر گولیاں

بھی چلائیں۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی قتل کی گئیں۔ سرینگر کے عوام کو گاڑیوں سے سڑکیں صاف کرنے اور ریلوں پر سے سینے کے بل رینگ کر گذرنے پر بھی مجبور کیا۔ جرمانوں اور تعزیری ٹیکسوں کے ذریعہ غریب لوگوں کی جیبیں خالی کر کے ناکام کرائیں۔ لیکن یہ سب کچھ کر کے کیا اس نے نیشنل کانفرنس کو ختم کر لیا؟ دنیا کی تاریخ ہرگز نہیں بتا سکتی۔ اور اسے خود اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس کی یہ تمنا ناکامی کی موت مر کر اس کے سینے میں دفن ہو گئی ہے۔ اصل میں اس کے برخلاف نیشنل کانفرنس پر وزیر اعظم اور ڈوگرہ حکومت کے حملہ آور ہونے کی وجہ سے نیشنل کانفرنس کو وہ فائدہ پہنچا جو دوسری کسی صورت میں پہنچنا ناممکن تھا۔ جس طرح اس سکیم کے پہلے چار حصے نیشنل کانفرنس کو ختم کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ اسی طرح اس کی دیوانگی کا خواب بھی خواب پریشان ہو کر رہ جائے گا۔ اور آخرکار کامیابی حق و صداقت کو ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ میرا یہ دعویٰ مبالغہ پر محمول کیا جائے۔ اس لئے اس دعوے کی وضاحت کے لئے آپ کو امور ذیل کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

حق کی تازہ فتوحات

کشمیر کی تازہ تحریک آزادی کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہوئے اس امر کی تحریک آج تک قرار دی جانی چاہئے کہ عوام کا موجودہ مطالبہ اور اس کی آواز دور دور تک پہنچ گئی ہے اور واضح طور پر دنیا کے سامنے آ گیا ہے۔ اور موافق و مخالف ریاستی و غیر ریاستی سب اس سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ اور اس کے نتیجہ اور فوائد کی نسبت یہاں کے عوام جو کچھ باہر کی رائے قائم کر سکتے ہیں۔

(۱) ہندوستان میں اس وقت جو سیاسی طاقتیں یا حلقے ہیں ان کے ساتھ حالات یہ نتیجہ خیز اثر ڈالا گیا کہ نیشنل کانفرنس کی تحریک اچھی طرح یاد کیا جاسکے۔

(۲) انتہائی دلچسپی اور علمی اقتدار کے ساتھ حمایت کرنے والے عوام اپنے راستے میں اٹل ہونے والا مخالفتوں کا کچھ نہ کچھ علاج ... انتہائی کے ساتھ

آخری تصادم کے وقت اس تجربہ کی روشنی میں وہ اپنی تیاریاں کر سکیں۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ تینوں مقاصد "کشمیر کو چھوڑ دو"، "بیعنامہ امرتسر کو توڑ دو" کے نعروں اور اس کے نتیجہ میں ریاست کے اندر اور باہر پیش آمدہ واقعات سے پورے ہو گئے ہیں۔

منزل مقصود کا آخری تعین

مثلاً پہلے مقصد کو لیجئے ۱۹۳۱ء سے اب تک حکومت کشمیر سے عوام نے جو مطالبات کئے وہ بہت ابتدائی اور عمومی نوعیت کے تھے۔ اور اکثر پورے نہ ہوئے جس سے عوام کی بے چینی، بے اطمینانی، آزادی اور خود مختاری کے لئے تڑپ بڑھتی گئی۔ اور انہوں نے جب بھی اپنے مطالبوں کی ناکامیوں کا جائزہ لیا۔ تو ان پر واضح ہوا کہ امیدوں کی تمام کشتیاں صرف ایک چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکی ہیں۔ اور وہ چٹان مہاراجہ کشمیر کی مطلق العنانی اور اقتدار، اختیار سے عوام کی محرومی ہے۔ اس لئے ان کے دل کی صدا یہی تھی کہ جب تک مطلق العنانیت کے اس پتھر پر گرز البرز شکن کی کاری ضرب نہ پڑے۔ ترقی کی طرف کشمیر کے بے دست و پا عوام مزید ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ یہ یقین اب تک لوگوں کے دلوں میں دبا ہوا تھا۔ ان کے دل کی شہادت تو یہی تھی کہ شخصی حکمران سے نجات ہی ان کی صحیح منزل مقصود ہو سکتی ہے مطلق العنان حاکم کے سایہ میں ذمہ دار نظام حکومت کی بے حقیقتی سے واقف ہو چکے تھے۔ اور خوب جان چکے تھے کہ مکمل ذمہ دار نظام حکومت اور شخصی حکمران ایسی دو تلواریں ہیں جو ایک نیام میں نہیں سما سکتیں۔ لیکن اس نئے یقین کو جب تک قومی نعرے کی صورت نہ دی جائے اس وقت تک دلوں میں چھپا ہوا یقین بے فائدہ ہے۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک یقین پیدا ہوا دل ہی میں دبا رہا۔ لب تک آنے کا راستہ نہ پا سکا۔ اور اسی طرح مر کر وہیں دل ہی میں دفن ہو گیا۔ اس موقع پر پھر سوال پیدا ہوتا تھا کہ عوام کے اس نئے یقین کو اجتماعی شکل دینے کے لئے کون سامنے آئے۔ ظاہر ہے کہ شیر کشمیر کے سوا کوئی لیڈر ایسا نہ ہو سکتا

تھا جو اُس جرأت آزما مرحلے پر قدم رکھے۔ اور نیشنل کانفرنس کے سوا کسی دوسری تنظیم میں یہ ہمت نہیں تھی کہ اپنے قافلہ کو لیکر اُس پُرخار وادی کا سفر اختیار کرے۔ جس کا تصور ہی بہتیروں کو لرزہ براندام کر دیتا ہے ؎

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے
بلا یہ کون لیتا اپنے سر لیتے تو ہم لیتے

اسی فرض کو انجام دینے کے لئے "کشمیر چھوڑ دو" بعینا مہ امرتسر توڑ دو" کا نعرہ شیر کشمیر نے بلند کیا۔ اور اب یہ نعرہ اس وطن کے بچے بچے کی زبان پر ہے حکومت کے تشدد نے اس نعرہ کو لوگوں کے دلوں پر نقش کرنے میں جو بڑی امداد دی۔ وہ اندازے سے باہر ہے۔ اور عوام کے جان و مال کی جو قربانی اس نعرے کی تائید میں وصول کی گئی۔ وہ اس بات کی غماز ہے۔ کہ اب اس نعرے کی کامیابی شک و شبہ سے بالاتر ہو چکی ہے۔

بیرونی تائید و حمایت کا حصول نیشنل کانفرنس کے سامنے نئے نعرے کی تبلیغ کے علاوہ یہ مقصد بھی تھا کہ ہندوستان کی بڑی سیاسی جماعتوں پر اپنے نئے مطالبے کا حق بجانب ہونا ثابت کر کے ان کی خیرخواہی ہمدردی اور حمایت سے ریاست کی تحریک آزادی کو جتنی کچھ تقویت ممکن ہو سکتی ہو۔ پہنچائی جائے۔ اب پانچ مہینے کے واقعات پر نظر ڈال کر دیکھ لیجئے۔ نیشنل کانفرنس اس مقصد میں اتنی کامیاب رہی کہ اگر کاک وزارت نے اس پر حملہ نہ کیا ہوتا۔ تو یہ کامیابی کہیں برسوں تک جا کر میسر ہو سکتی۔

اس وقت ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگرس کے علاوہ جو سیاسی جماعتیں ریاستی سیاسیات پر کسی نہ کسی رنگ میں اثر ڈال سکتی ہیں۔ وہ سٹیٹ پیپلز کانفرنس، انڈین مسلم لیگ کمیونسٹ پارٹی۔ کانگرس سوشلسٹ پارٹی اور جمعیۃ العلماء وغیرہ تنظیمات ہیں۔ جو رائے عامہ

کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اور کسی مطالبہ کی تائید میں عوام کو منظم کر سکتی ہیں۔ ہمارے مطالبے کو ان سب کی تائید حاصل ہوئی ہے۔

کانگریس سے تائید

نیشنل کانگریس نے کشمیر چھوڑ دو کے نعرہ کی اگرچہ ۵۰ فیصدی تائید کی ہے کیونکہ وہ ابھی تک دیسی حکمرانوں کے "حق پسندی" اور "حب وطن" کی نسبت غلط فہمیوں اور بے جا امیدوں کے دائرے سے باہر نہیں نکلی لیکن بیعنامہ امرتسر کو توڑ دو کی تائید نیشنل کانگریس نے ۱۰۰ فیصدی کی۔ اور محترم پنڈت نہرو، مسٹر آصف علی، حضرت پادشاہ خان اور دیگر کانگریسی رہنماؤں نے خود کشمیر آکر تحریک آزادی کو جو تقویت پہنچائی اس کا سبب حکومت کا ہی جارحانہ اقدام ہی تھا۔ اور اب کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے تحقیقات کی نسبت جو فیصلہ کیا ہے۔ وہ بھی حکومت کشمیر کے تشدد اور سخت گیری کا ہی ردعمل ہے۔ جو آخر کار ریاستی حکمرانوں کے معاملے میں کانگریس کو وہ پوزیشن اختیار کرنے کے مرحلہ کی طرف لے جائیگا۔ جو اس وقت آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس نے اختیار کر رکھی ہے۔ اس وقت بھی نیشنل کانفرنس کے ساتھ انڈین کانگریس کو ان تین باتوں پر مکمل اتفاق ہے۔

(۱) ریاستوں کے سابق معاہدات ختم کر دئے جائیں۔

(۲) مکمل ذمہ دار نظام حکومت قائم کیا جائے۔

(۳) آخری اختیار اور اقتدار عوام کو حاصل ہو۔

صرف ایک امر ایسا ہے جو کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ عوام سے پوچھے بغیر ہی انڈین کانگریس راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کو ان کی ریاستوں میں آئینی حکمران کا حق دینے کے لئے تیار ہے۔ مگر جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس عوام کی [illegible] کے بغیر ایسے حق کے لئے کسی چیز کو وجہ جواز تسلیم نہیں کرتی ہے

وجہ ہے کہ میں نے کانگریس کی تائید کو تحریک آزادی کشمیر کے حق میں صرف ۵ ، فیصدی قرار دیا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ کشمیر کی حکومت اور بعض دوسری ریاستی حکومتوں کا ظلم و تشدد کانگریس کو بہت جلد ہمارے ساتھ متفق کر دیگا۔ ع

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

ریاستی کانفرنس سے تائید ریاستی رعایا کی کانفرنس (آل انڈیا سٹیٹس پیوپلز کانفرنس) اگرچہ والیان ریاست کی آئینی حکمرانی کو کانگریس ہی کی طرح تسلیم کرتی ہے۔ اور مکمل ذمہ دار نظام حکومت ان کے زیر سایہ مانگتی ہے لیکن عملاً یہ کانفرنس روز بروز نیشنل کانفرنس کے روّیہ کو اختیار کرنے کی طرف جھک رہی ہے۔ تقریباً ہر ریاست کی جداگانہ تنظیمیں اپنے تجربوں کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچ رہی ہیں جس پر پہنچ کر نیشنل کانفرنس نے "کوئٹ کشمیر" کا نعرہ لگایا ہے۔ اس لئے پچھلے پانچ مہینوں کے دوران میں ریاستی عوام کی کانفرنس نے نیشنل کانفرنس کے مطالبہ کی غیر مشروط حمایت کی۔ اور اب اکثر ریاستوں کی سیاسی جماعتیں کوئٹ کشمیر ایسی تحریکات شروع کرنے کی طرف مائل ہو رہی ہیں۔

مسلم لیگ سے حمایت جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے۔ وہ اپنی گوناگوں مصلحتوں کی وجہ سے ریاستی معاملات میں زیادہ تر غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اگر کہیں دخل بھی دے۔ تو اس پر عدم مداخلت کا غلاف چڑھا کر ہی پیش کرتی ہے لیکن اس کے باوجود نیشنل کانفرنس کے نعرہ "کشمیر چھوڑ دو" اور بیعنامہ امرتسر توڑ دو" کی جتنی تائید مسلم لیگ کے اکثر رہنماؤں اور اخبارات نے کی۔ وہ لیگ کی اجتماعی تائید سے کم نہیں۔ حالانکہ لیگ کا دم بھرنے والے یہاں کے مقامی افراد کو کاگ وزارت نے اپنے شیشے میں اتار لیا تھا۔ اور وہ کوشش کر رہے تھے کہ مسلم لیگ نیشنل کانفرنس کے قتل نامہ پر تائیدی دستخط کرا دیں۔ مگر ان کی یہ کوشش بار آور نہ ہوئی۔

انتہا پسند پارٹیوں سے

کمیونسٹ پارٹی اور سوشلسٹ پارٹی نے نیشنل کانفرنس کی حمایت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ کمیونسٹ پارٹی کا پریس اور پلیٹ فارم کشمیر کے لیے وقف رہا۔ کامریڈ پی۔ سی جوشی اور کامریڈ پام دت کے بیانات یورپ کے پریس میں چھپتے رہے۔ کشمیر کو "لال اسلام کا دن" اس پارٹی نے ہندوستان کے طول و عرض میں منایا جس میں عوام کی مظلومیت اور حکومت کے ظلم و ستم سے لاکھوں ہندوستانیوں کو آگاہ کر کے تحریک آزادی کشمیر کی تائید میں رائے عامہ منظم کی۔ کانگرس سوشلسٹ پارٹی کے رہنماؤں کامریڈ جے پرکاش نرائن اور کامریڈ منشی احمد الدین نے اپنے بیانات میں اس تحریک کی تائید کی۔ اور حال ہی میں بمقام دہلی اس پارٹی کی مرکزی انتظامیہ نے ایک تجویز پاس کر کے انڈین نیشنل کانگرس سے ایک مطالبہ کیا ہے کہ وہ والیان ریاست کی مطلق العنانیت کو ختم کرنے کے لیے ان کے وجود کو ہی اڑا دینا اپنے پروگرام میں شامل کرے۔ علیٰ ہذا القیاس جمعیۃ العلماء مجلس احرار وغیرہ آزادی پسند جماعتوں کی تائید بھی ہمارے نعروں کو حاصل رہی۔

اگر حملہ نہ ہوا ہوتا تو

یہ تمام تائید نیشنل کانفرنس کو عام حالات میں ہرگز حاصل نہ ہو سکتی۔ صرف وزیر اعظم کا جارحانہ حملہ واحد سبب تھا۔ جس نے کانگرس، ریاستی کانفرنس مسلم لیگ، کمیونسٹ پارٹی اور کانگرس سوشلسٹ پارٹی اور ان کے علاوہ جمعیۃ العلماء مجلس احرار وغیرہ تمام قابل ذکر اور آل انڈیا پوزیشن رکھنے والی سیاسی جماعتوں کو نیشنل کانفرنس کے نعرۂ آزادی کشمیر کی تائید میں صف آرا کر دیا۔ یہ دیکھ کر کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ کاک وزارت کے اس تشدد کا شکریہ ادا کیا جائے جس کا سلسلہ ۲۰ مئی ۱۹۴۶ء سے شروع کیا گیا۔ اور جس نے نہ صرف باشندگان کشمیر و جموں کو ان کے آخری نصب العین تک پہنچا دیا۔ بلکہ ہندوستان کے ۴۰ کروڑ انسانوں کو اس

نصب العین کی تائید میں منظم کر دیا۔

ہماری آزادی پورے ہندوستان کی آزادی ہے

اس موقعہ پر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کی مکمل آزادی ریاستی عوام کے آزاد ہونے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اگر ایک انسان کے دو ہاتھ اور ایک پاؤں آزاد ہوں۔ اور ایک پاؤں بیڑیوں اور زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو۔ تو اس کو کون آزاد کہے گا۔ انگریز کے چلے جانے اور کانگرس اور مسلم لیگ کے متحد ہو کر جمہوری ہندوستان کے لئے نیا آئین بنا لینے کے باوجود بھی ہندوستان اس وقت تک آزاد نہ کہلائیگا۔ جب تک نو کروڑ اور تیس لاکھ ریاستی باشندے بھی زمانۂ جہالت کے وحشیانہ جاگیری نظام سے آزاد نہیں ہو جاتے۔ ایک وقت عنقریب آئیگا جب ریاستی باشندوں کی آزادی کے لئے باقی تمام ہندوستانیوں کو ایک سرگرم جنگ میں حصہ لینا پڑے گا۔ اور والیان ریاست کا کھلا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اور ہندوستان کی مکمل آزادی کے لئے آخری جنگ یہی جنگ ہوگی۔ ریاستوں کی سیاسی تنظیمیں اس وقت اپنے اپنے دائرے میں آزادی کی اسی آخری جنگ کے لئے راستہ صاف کر رہی ہیں۔ اور ان دنوں آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس جہاد آزادی کے اسی مورچہ پر ہراول دستے کا فرض انجام دے رہی ہے۔ کانگرس، لیگ، کمیونسٹ پارٹی اور کانگرس سوشلسٹ پارٹی وغیرہ جماعتوں نے "کشمیر چھوڑ دو" نعرہ کی تائید کرتے ہوئے نیشنل کانفرنس کی جس تحریک کو تقویت پہنچائی ہے۔ وہ صرف جموں و کشمیر کے چالیس لاکھ انسانوں کے لئے آزادی کی تحریک نہیں۔ بلکہ پورے چالیس کروڑ ہندوستانیوں کی آزادی کی تحریک کا بہت اہم حصہ ہے۔

بہر صورت نیشنل کانفرنس کا یہ دوسرا مقصد محض نیشنل کانفرنس پر حکومت کے حملہ کی وجہ سے توقعات سے بڑھ چڑھ کر پورا ہوا۔ ہماری اس کامیابی کے مقابلہ میں حکومت نے اس حملہ سے کیا کچھ اور کس قدر فائدہ اٹھایا۔ یہ وہی بہتر جانتی ہوگی ہیں تو صرف نیشنل

کانفرنس کے Credit اور Debit کی نسبت ہی بتا سکتا ہوں۔

عوامی حوصلہ

اب تھوڑا سا جائزہ اس بات کا بھی لیجئے کہ شخصی حکومت کے خلاف لوگوں کو حق کی آواز بلند کرنے کی ہمت دلانے اور ان کے دلوں سے شخصی حکومت کا رعب و داب اور خوف ہمیشہ کے لئے دور کر دینے کا جو مقصد نیشنل کانفرنس کے سامنے تھا۔ اس تحریک سے وہ پچھلے پانچ مہینوں کے دوران میں کس حد تک پورا ہوا۔ اب کشمیری عوام کی جرأتیں صرف اس حد تک بڑھ سکی تھیں کہ وزرا کی سختیوں کے خلاف چیخیں چلائیں۔ حاکموں کے ظلم کا تذکرہ کھلے بندوں کر ڈالیں۔ کسی سخت گیر کو ظالم راشی کو بددیانت اور فرض ناشناس کو خائن کہہ کر پکار دیں لیکن ان میں یہ ہمت نہ تھی کہ وہ براہ راست جمہور اور مہاراجہ کے حقوق کی ٹکر پر بحث کریں۔ اور عوام کے حقوق اور عوام کے مفاد پر حکمران کا جو بے جا قبضہ ہے۔ اس پر سٹیج سے تنقید کریں لیکن نیشنل کانفرنس جمہور کو جس سیاسی رتبے پر لے جانا چاہتی ہے۔ اس کا تقاضا یہی تھا کہ لوگوں میں ایسا کرنے کی جرأت پیدا ہو جائے۔

حوصلہ کیسے بڑھ رہا ہے؟

تحریک آزادی کا مقصد تقاضا کر رہا تھا کہ عوام نہ صرف مہاراجہ کے اقوال و افعال اور حقوق کو زیر بحث لائیں۔ اور جن عوامی مفاد کے ساتھ مہاراجہ کی موجودہ پوزیشن ٹکراتی ہے۔ ان کی حمایت میں کھڑے ہو جائیں۔ بلکہ یہ تقاضا بھی کرتا تھا کہ اس جرأت اور دلیری کا مظاہرہ کرنے کی پاداش میں ان پر جو سختیاں ممکن ہیں۔ ان کو جھیلنے کے بھی عادی ہو جائیں۔ اور اس سلسلہ میں ان کے دل خوف و خطر سے خالی ہو جائیں۔

"عدو شود سبب خیر......"

۲۰ مئی سے عوام پر ظالمانہ تشدد کا جو سلسلہ شروع ہوا۔ اس نے یہ تمام مقاصد پورے کر دئے۔ بچے بچے میں یہ جرأت آ گئی کہ وہ آخری سے آخری مطالبہ کو بازار میں کھڑے ہو کر دہرائے۔ اور ایسا

کرنے کے لئے لاٹھی۔ گنڈاسنگین۔ گولی۔ قید و بند۔ جرمانہ۔ تعزیری ٹیکس ہر ایک قربانی پہ آمادہ ہو جائے۔ یہ کوئی چھوٹا مرحلہ نہیں تھا۔ جو طے ہوا۔ برسوں تک حق کی آواز دلوں سے اٹھ کر زبان پر آتی ہے۔ مگر لب آشنا نہیں ہوتی۔ اور جانی و مالی قربانی پہ تو قومیں کہیں صدیوں کے بعد خاک آمادہ ہوتی ہیں۔ اب تک قربانی کے میدان میں کشمیریوں نے صرف مذہب کے نام پر، دفتری حقوق کے نام پہ، اور آئینی اصلاحات اور بعض ابتدائی حقوق کے نام پر قربانیاں دی تھیں۔ شبہ تھا کہ مہاراجہ سے آخری اقتدار و اختیارات کا مطالبہ کرنے میں بھی یہ لوگ ایثار و قربانی کا پہلا سا مظاہرہ کریں گے یا نہیں۔ ان پانچ مہینوں کے تجربہ نے اس خدشے کو دور کر دیا۔ اور آج پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کشمیری اب اتنے بیدار، باہمت اور باعزم بن چکے ہیں کہ آزادی کی اونچی سے اونچی سطح پر پہنچنے کے لئے ان کے سامنے کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہو سکتی۔ اور آزادی اور مکمل آزادی کے لئے اب وہ کوئی بھی قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایک زندہ قوم کی صرف یہی علامت ہے۔

طلسم ٹوٹ گیا

"حکومت"۔ "سلطنت"۔ "ملوکیت"۔ "بادشاہ"۔ "مہاراجہ"۔ "نواب" یہ تمام ایسے جادو سے بھرے ہوئے الفاظ ہیں کہ نسلوں کی نسلیں ان سے مسحور ہو کر ان کے گرد طواف کرتی رہتی ہیں۔ اور اپنے خون کی بھینٹ دے کر ان کو پالتی ہیں۔ دلوں کو ان کے رعب سے آزاد کرنا بڑا ہی مشکل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جابر بادشاہ کے سامنے سچی بات بے باکی سے کہہ دینا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بڑا جہاد اور بہادرانہ کارنامہ قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اعظم الجہاد کلمۃ حق عند السلطان جابر۔ یوں تو ہر طلسم کی طرح راج اور سلطنت کا طلسم بھی بڑا نازک ہوتا ہے لیکن ہر شخص کو اس کی کمزوریاں معلوم نہیں ہو سکتیں۔ مدتوں کے بعد بقول اقبال کوئی مرد فقیر سامنے

آتا ہے۔ جس کے قلندرانہ نعرے کی آگ میں یہ طلسم بھسم ہو کر رہ جاتا ہے ؎

مردِ فقیری آتش است میری و سروری خس است

فال و فرِ ملوک را حرف برہنہ بس است

"کشمیر چھوڑ دو"۔ "بیعنامہ امرتسر توڑ دو"۔ "اقتدار عوام کا حق ہے"۔ یہ نعرے کیا تھے۔ یہی "حرفِ برہنہ" تھے۔ جنہوں نے ایک طرف عوام کے غلامانہ عقیدوں میں تبدیلی کی۔ اور ان کے دلوں میں حریت و آزادی کا یقین بھر دیا۔ اور دوسری طرف ملوکیت کے ایوان میں وہ زلزلہ ڈالا کہ اب ہر ایک اینٹ دوسری اینٹ سے جدا ہونے کے لئے رخصت طلب کر رہی ہے۔

کاک وزارت کے حملہ کے بعد اہل کشمیر نے جو قربانیاں دیں۔ ان کا یہی ایک پھل کیا کم ہے! لیکن درحقیقت ان قربانیوں کا جو پھل ملنے والا ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی آنکھ کر سکتی ہے جو مستقبل تک رسائی حاصل کر سکتی ہے۔

چند مزید ثمرات

یہ اندازہ کر لینے کے بعد کہ مطالبہ آزادی کی وضاحت "ہندوستان کے قومی عناصر کی حمایت کا حصول اور آخری ٹکر کے لئے عوام کی آزمائش اور حصول "ہمت"۔ "تجربہ" بڑی بڑی وہ نعمتیں ہیں جو کشمیر کی قومی تحریک کو اس ابتلا میں حاصل ہوئیں۔ ذرا اس کشمکش کے چند مزید فائدے بھی ملاحظہ کر لیجئے۔

"کشمیر چھوڑ دو" کے نعرے اور نیشنل کانفرنس اور حکومت کی باہمی ٹکر نے جہاں نیشنل کانفرنس کی پوزیشن کو اونچا کر دیا۔ وہاں اس ریاست کی باقی جماعتوں کو بھی مجبور کر دیا۔ کہ وہ زیادہ نہ سہی، تو لفظی حد تک اپنی پہلی پوزیشنوں میں تبدیلی پیدا کریں۔

گونگے بھی بول اٹھے

سرینگر کی یووک سبھا اور جموں کی ہندو راجیہ سبھا اب تک ذمہ دار نظام حکومت کا مطالبہ اگر کبھی بمجبوری زبان پر لاتی تھیں۔ تو اس کے ساتھ سو سو شرطیں عائد کر کے اس کو ہر ممکن حد تک بے معنی اور ناممکن بنانے کی کوشش کرتی

تھیں۔ لیکن کشمیر چھوڑ دو کے نعرے کے بعد وہ دہلی تک پہنچتی چلاتی گئی کہ ہم ذمہ وار نظام حکومت کے مطالبہ کے حامی ہیں۔

مسلم کانفرنس کے پینترے

جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کو کشمیر چھوڑ دو کے مطالبہ نے دن میں چار چار پوزیشنیں تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔ یہ کانفرنس ہمیشہ کشمیری عوام کے مطالبات کی نسبت نیشنل کانفرنس کی مقلد رہی ہے۔ اور ایسا کرنے کے لئے مجبور ہے۔ کیونکہ اگر نیشنل کانفرنس سے زیادہ انتہا پسندانہ مطالبہ کریں۔ تو اس کے لئے قربانی دینی پڑے گی۔ اور نیشنل کانفرنس سے پیچھے رہے۔ تو اپنے فوری خاتمے سے ہمکنار ہونا پڑے گا۔ اس لئے یہ ہمیشہ نیشنل کانفرنس کے مطالبوں کو لفظی تغیر کے ساتھ دہرا کر دن دن کاٹنے کی عادی ہے۔

متحدہ محاذ کی ضرورت

چونکہ بظاہر نیشنل کانفرنس کے مقصد حصول ذمہ وار نظام حکومت اور مسلم کانفرنس کے اس مقصد میں کوئی تفاوت نہ تھی۔ اور پچھلے سال سوپور میں فوری اصلاحات کی نسبت نیشنل کانفرنس نے جو ریزولیوشن پاس کیا تھا۔ سردیوں میں بمقام جموں مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے اس کو دہرا دیا تھا۔ اس لئے ملک اور قوم کے بہی خواہ بالخصوص نیشنل کانفرنس کے زعماء کچھ مدت سے مسلم کانفرنس کو متحدہ محاذ کی دعوت دینے لگے۔ اور یہ دعوت اب بھی قائم ہے۔ اور ۲۰ مئی تک اس کی عملی صورتیں دونوں طرف زیر بحث تھیں۔ اور عام طور پر یہ امید کی جارہی تھی کہ دونوں تنظیمیں اختلافی امور کو ایک طرف رکھ کر متفقہ مطالبات کے حصول کے لئے ایک محاذ پر آجائینگی لیکن مسلم کانفرنس میں ایسے افلاطونوں کی کمی نہیں جو اس موقعہ پر متحدہ محاذ اور واحد تنظیم کے فرق کو سمجھنے سے قاصر رہے اور متحدہ محاذ سے ان میں سے بعض کے اغراض کو جو خطرہ لاحق ہوا۔ وہ بھی اپنا کام کرتا رہا جس سے متحدہ محاذ کے خواب کی

تعبیر کسی آئندہ مبارک وقت کے لئے ملتوی ہوگئی۔

"غیر جانبداری"

اس کے باوجود "کوئٹ کشمیر" بعینا مہ امرتسر توڑ دو" کا نعرہ بلند کرنے کے وقت ۲۰ مئی کی تقریر میں قائد اعظم حضرت شیر کشمیر نے مسلم کانفرنس والوں سے دردمندانہ اپیل کی تھی کہ وہ مشترک اور متفقہ مقاصد کے لئے کشمیر چھوڑ دو کے نعرے میں دوش بدوش میدان میں اتریں۔ تاکہ حکومت ان کی علیحدگی سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اور اگر ہمارے ساتھ متحدہ محاذ نہ بنائیں تو کم از کم مخالف محاذ یعنے حکومت کو تقویت پہنچانے سے ہی اجتناب کریں۔ بغیر جانبدار عوام کے مقاصد کی کامیابی کے لئے دعا گو رہیں لیکن بدقسمتی سے مسلم کانفرنس والے نہ صرف قربانیاں دینے سے جی چرا کر گھر بیٹھ گئے۔ بلکہ اس آخری دیانتدارانہ طرز عمل کو بھی اختیار نہ کر سکے۔ گو زبان سے ایک تجویز کے ذریعہ اپنے آپ کو ایک غیر جانبدار قرار دیا لیکن ان کی اس "غیر جانبداری" کے عملی نمونے وہ الزامات ہیں۔ جو چوہدری غلام عباس صاحب، میر واعظ صاحب اور ان کے باقی ساتھیوں کے اس دوران میں شائع شدہ بیانات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور کوہالہ پل پر مظاہرہ کرنے کے لئے سرینگر کے مسلم کانفرنسیوں کی جانب سے کاک وزارت کو کرائے کے آدمی مہیا کرنا اس نام نہاد غیر جانبداری کے تابوت میں وہ آخری کیل تھی۔ جس نے اس بے چاری کو زندہ درگور کر دیا۔ اور ثابت کر دیا کہ بددیانتی غرض پرستیوں، ریاکی رقابتوں اور ذہنی افلاس نے مسلم کانفرنس کے رہنماؤں کو کاک وزارت کا غلام بے دام بنا کر رکھ دیا ہے ؎

ہو اگر قوت فرعون کی درپردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی

آزاد کشمیر کا نعرہ

غیر بیرا مقصد اس موقع پر مسلم کانفرنس کی ان غداریوں کا انکشاف

کرنا نہیں جس کا ثبوت اس نے اس تحریک میں دیا۔ بلکہ صرف یہ بیان کرنا ہے کہ ان تمام حالات کے باوجود مسلم کانفرنس اپنے مقاصد میں نمایاں اور مؤثر تبدیلی کا اعلان کرنے پر مجبور ہوئی۔ اس نے جہاں اپنی بزدلی کو چھپانے کے لئے "فوری مطالبات" اور "ڈائرکٹ ایکشن" کی تجویزوں کے ذریعہ اپنے پیرووں کی آنکھوں میں زینہ کدل کے چوراہے کی مٹی پھینکی وہاں "آزاد کشمیر" کی تجویز بھی پاس کی۔ اور یہ "آزاد کشمیر" کیا ہے۔ بلکہ درحقیقت وہی "نیا کشمیر" جو "کوئٹ کشمیر" کا تقلیدی ایڈیشن ہے جس کے سہارے کے بغیر مسلم کانفرنس موجودہ بحران میں زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔

وضاحت کا مطالبہ غیر ضروری ہے

کچھ لوگ مسلم کانفرنیوں سے بار بار مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے اس نئے نویلے نعرے "آزاد کشمیر" کی وضاحت کریں۔ اور بتائیں کہ اس مہمل لفظ سے ان کا مقصد کیا ہے۔ میرے خیال میں اس نعرے کا مطلب اتنا پوشیدہ نہیں کہ ان لوگوں سے تشریح کا مطالبہ کیا جائے۔ ہر ایک لفظ کو وہ ماحول معنی اور مفہوم عطا کرتا ہے جس ماحول کے درمیان اس کی پیدائش عمل میں آتی ہے۔ "آزاد کشمیر" لفظ کی ایجاد جس ماحول اور فضا میں ہوئی ہے۔ اس پر ایک نگاہ ڈالئے۔ تشریح خود بخود ہو جائیگی۔ اس لفظ کو نعرے کے طور پر عاملہ مسلم کانفرنس نے ۶ سے ۸ رجون ۱۹۴۶ء تک کے اجلاس میں اختیار کیا جبکہ سرینگر کے ہر کوچہ میں "کشمیر چھوڑ دو"۔ "بیعنامہ توڑ دو" اور "ڈوگرہ راج ختم کرو" کے نعروں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس اسی فضا پر غور کرنے اور تحریک کی حمایت یا عدم حمایت کا فیصلہ کرنے کے لئے منعقد ہوا۔ اجلاس میں تین دن کی بحث کے بعد بزدلی کو غلبہ حاصل رہا۔ اس لئے تحریک میں شمولیت کا فیصلہ نہ ہوا۔ اب خطرہ تھا کہ اپنے پیرو رجعت پسندی کی کوئی سزا نہ دیں۔ لہذا "آزاد کشمیر" کے لفظ کے پیچھے آڑ لی گئی۔ اس وقت "آزاد کشمیر" کی تشریح کا مطالبہ ان سے نہ کیجئے جب

"کوئٹ کشمیر" کا نعرہ حکومت کے تشدد کو پسپائی پر مجبور کریگا۔ تو یہ لوگ خود کہہ دیں گے کہ "آزاد کشمیر" "کوئٹ کشمیر" جمع "نیا کشمیر" ہی کا دوسرا نام ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ چڑھ کر ثابت کرنے کی کوشش بھی کریں گے۔ بہر صورت پوزیشن کی یہ تبدیلی مسلم کانفرنس کے کسی اندرونی عزم و ارادہ کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ نیشنل کانفرنس کی مجبورانہ تقلید ہے۔ جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔

ریاست کی سیاسی انجمنوں کی یہ کیفیت بتاتی ہے کہ "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک نے سب کو جھنجھوڑ ڈالا ہے۔ اور یہ چیز بھی اس تحریک کی کامیابیوں میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔

۲۰ مئی کے بعد کے واقعات نے ان بڑے بڑے فائدوں کے علاوہ چند ایک سبق بھی بہم کر دئے۔ جو بجائے خود بھاری فائدہ ہیں۔ اور جن کی روشنی میں آیندہ ایسا پروگرام مقرر کرنے میں نیشنل کانفرنس کو بڑی سہولتیں ملیں گی۔ اور وہ اس وقت مشعل راہ کا کام دیں گی۔ جب ہم آخری جنگ کا بگل بجائیں گے۔

ابھی تحریک شروع نہیں ہوئی

ان تفصیلات کے بعد یہ امر صاف ہو جاتا ہے کہ نیشنل کانفرنس نے حکومت کے ساتھ ابھی اس مسئلہ پر کوئی ٹکر نہیں لی۔

ابھی تک حملہ صرف حکومت کی طرف سے ہوا ہے جس نے تمام رہنماؤں اور بڑے کارکنوں کو راتوں رات بے خبری کے عالم میں گرفتار کر کے کانفرنس کو مدافعت کا موقعہ بھی نہیں دیا۔ اور اس کے بعد عوام کی جانب سے جو کچھ ہوا۔ وہ صرف احتجاج کے عنوان میں آتا ہے۔ اور اس کو تحریک اور اقدام کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ مگر اس کے باوجود عوام نے آج جو قربانیاں دی ہیں۔ وہ قیدیوں کی تعداد، برداشت کئے ہوئے تشدد کی نوعیت اور تعزیری ٹیکس و جرمانہ کے اعتبار سے پچھلی تمام تحریکوں میں دی ہوئی قربانیوں سے بہت زیادہ ہیں۔ اور حکومت کے جبر و تشدد و تفرقہ بازی و مکاری و عیاری تینوں محاذوں کو یکجا کر لینے اور نیشنل کانفرنس پر طوفانی حملہ کرنے کے باوجود نیشنل کانفرنس کو مٹا ڈالنے کی تمنا میں جو ناکامی ہوئی

وہ نیشنل کانفرنس کی فتح اور کاک وزارت کی شکست کا ادنیٰ سا ثبوت ہے۔

تشدد سے تحریک نہیں دبتی!

یہ ٹھیک ہے کہ کاک وزارت نے شیر کشمیر کو تین سال کی سزا بھی اس لیئے دی ہے کہ اس عرصہ میں کاک صاحب ریاست کے دیوان بن سکیں۔ اور رجعت پسند عناصر کو برسر اقتدار لاکر اپنی تمنائیں پوری کر سکیں۔ کیونکہ مسٹر کاک کی مدت ملازمت تین ہی سال کے اندر ختم ہو رہی ہے۔ اور اس مدت میں شیر کشمیر کو بند رکھ کر وہ من مانی کر سکتا ہے لیکن یہ سب ان کی خام خیالیاں ہیں۔ آزادی کی تحریکیں اس طرح ختم نہیں ہو سکتیں۔

قومی فیصلہ

"کشمیر چھوڑ دو" کا نعرہ اب صرف ایک رہنما اور اس کے گنے ہوئے ساتھیوں کا انتہا پسندانہ خیال نہیں رہا۔ اب یہ نعرہ قومی فیصلے اور عوامی عقیدت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اور قومیں جب کوئی فیصلہ کر لیتی ہیں۔ تو اس کو دبانا کسی طاقت کے بس کی بات نہیں رہتی۔ شیخ محمد عبداللہ نے یہ نعرہ لگا کر جو چراغ جلایا تھا۔ اس سے اب ہزاروں چراغ روشن ہو چکے ہیں۔ اب تو ہر طرف دیوالی ہی دیوالی ہے۔ رجعت پسندی کی نمائندہ اور تاریکی پرست چمگادڑیں کس کس پر پر مارینگی۔ اور ولولۂ حریت کے ان چراغوں کی تعداد اب گھٹنے کی نہیں۔ یہ تو لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہی جائیں گی۔ اور ایک وقت آئے گا جب ریاست کے چالیس لاکھ انسانوں میں سے ایک فرد بھی اس تحریک کے دائرے سے باہر نہیں رہیگا۔

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود
ایں مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود
آنچہ بود لیست و نہ بایست نہ خواہد بودن
آنچہ بایست و نہ بود است ہماں خواہد بود

تحریک کا دوسرا قدم

پنڈت رام چندر کاک نے اپنے منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے قائدِ اعظم شیخ محمد عبداللہ کو تین سال سزا دلوا کر عوام سے جدا کر دیا ہے لیکن تین سال سزا کیا چیز ہے۔ اور بادامی باغ کا قلعہ کونسی اتنی خطرناک جگہ ہے۔ کاک وزارت تجربہ کرنا چاہتی ہے۔ تو شیرِ کشمیر کو اس سے بھی کوئی بڑی اور ہولناک سزا دے دے۔ کشمیر کے جتنے محبوب رہنماؤں کو اس وزارت نے نظربند کر رکھا ہے۔ ان میں مزید ہزار دو ہزار کو شامل کر کے ادھمپور اور کٹھوعہ کے بدلے لداخ یا گلگت کے کسی قلعے میں ڈال دے۔ نیشنل کانفرنس کے پریس اور پلیٹ فارم کی طرح اس کے نام کو بھی خلاف قانون قرار دیکر اس کی ممبری کے ہر مدعی کو جیل خانے میں بند کر دے۔ تو بھی وہ تحریک کو ختم کرنے میں ناکام رہے گی۔ اور تحریک پہلے سے دس گنا زیادہ وسعت اور جوش کے ساتھ ابھرے گی۔ اور کامیاب ہوگی۔ اور کشمیر کے لئے جو انقلاب مقدر ہو چکا ہے۔ وہ آکر ہی رہے گا۔

مجھ کو تو یہ دنیا نظر آتی ہے دگرگوں
معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا

زیرِ زمین جدوجہد

حکومتوں کے تشدد کے بعد لیڈروں کی عوام کے درمیان عدم موجودگی سے انقلابی تحریکات کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کرتا ہے۔ کہ جوش سے بھرے ہوئے بیتاب نوجوان آپ ہی اپنے لیڈر بن جاتے ہیں۔ ان کو اب یہ خطرہ نہیں ہوتا کہ ان کے کسی اقدام سے قوم لاتعلقی کا اظہار کرے گی۔ اور ایسے حالات میں نوجوانوں کو اس بات کا انتظار بھی نہیں ہوتا کہ تنظیم کی طرف سے پروگرام آئے گا۔ اور ہم اس پر عمل کریں گے۔ وہ خود پروگرام بناتے ہیں۔ اور خود ہی عمل کر ڈالتے ہیں۔ کچھ وقت تک ایسے نوجوانوں کے پروگرام اور عمل ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ نہ رکھنے کی وجہ سے کم اثر بلکہ بے نتیجہ ہوتے ہیں لیکن جلد ہی متحدہ مقصد کی کشش ان بکھرے ہوئے ذروں کو جمع کر کے آفتاب

بنا دیتی ہے۔ اور وہ وقت آجاتا ہے جب ایک نیا ربط اور نیا انتظام کار فرما ہوجاتا ہے۔ اور ان میں سے نو کوئی مرد قلندر کہیں سے اٹھتا ہے۔ اور اپنا نعرہ لگاتا ہے۔ جس سے کوہ وصحرا گونج اٹھتے ہیں۔ حق کی طاقت جب اس طرح دب کر دوبارہ اٹھتی ہے۔ اور نئے ساز و سامان لیکر اٹھتی ہے۔ تو پھر دب نہیں سکتی۔ اس وقت دبنے کی باری باطل کی ہوتی ہے اور باطل جب دبتا ہے۔ تو پھر اس کا ابھرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔

لاکھوں لیڈر

شیخ محمد عبداللہ اور باقی رہنمایان کشمیر کو قوم سے جدا کر دینے کے بعد اب کشمیر میں حق و باطل کی آویزش بھی اسی مرحلے کے قریب آ رہی ہے۔ جو لوگ ایک عبداللہ، ایک بدھ سنگھ اور ایک افضل بیگ کو جیل میں ڈال کر چین کی بنسی بجا رہے ہیں۔ انہیں عنقریب کشمیر کے طول و عرض میں سینکڑوں عبداللہ، ہزاروں بدھ سنگھ، اور لاکھوں افضل بیگ سرگرم کار نظر آئیں گے۔ جو ان کی تمام خوش فہمیوں کا ازالہ کرنے کے لئے کافی ہوں گے۔ بہر حال یہ ہے کشمیر کا ماضی اور حال، اور اس کا مستقبل وہ ہوگا جو نیشنل کانفرنس اور قوم چاہے گی نہ کہ رجعت پسند طاقتیں۔

میرا اقدام

تحریک آزادی کشمیر کے اس پس منظر کے جستہ جستہ اشارے کر دینے کے بعد مجھے اپنے اقدام کے اسباب و علل کی نسبت کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ عوام کے مطالبۂ آزادی کو ختم کر دینے اور ان کی ترجمانی کرنے والی سرفروش جماعت کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے ڈوگرہ حکومت نے جو طوفان بد تمیزی مچا رکھا ہے اس کے ساتھ ٹکر لینا ہر ایک آزادی پرست انسان کے اولین فرائض میں شامل تھا۔ مجھ پر بھی فرض عائد ہوتا تھا کہ ہر ممکن تعجیل کے ساتھ میدان میں آکر ڈوگرہ ظلم و تشدد کو دعوت مبارزت دوں۔ لیکن زیر تربیت کام کی مصروفیتوں نے ۱½ ماہ تک فرصت نہ دی۔ اور ان مجبوریوں میں مجھے دل پر پتھر رکھ کر ۵ جولائی ۱۹۴۶ء تک صبر کرنا پڑا۔ اور

اس روز بھی بڑی مشکل سے میں تحریک کے زعیم، دو زرہنماؤں اور باقی ساتھیوں سے میدان میں آنے کی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔

استغاثہ کے الزامات

استغاثہ کا یہ الزام درست ہے کہ حضرت بل میں بھی کشمیر کے باقی حصوں کی طرح جلسے کرنا، جلوس نکالنا، اور تقریریں کرنا ڈوگرہ راج کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ممنوع قرار دے رکھی تھیں۔ مگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے میں نے ۵ جولائی ۱۹۴۶ء (۲۲ ہاڑ) کو ایک بھاری جلسے میں تقریر کی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ استغاثے کا الزام میرے کارِ اقدام اور عمل کے مقابلے میں ادھورا ہے۔ اور جو کچھ پولیس کے گواہوں نے بیان کیا۔ وہ در اصل واقعہ کا بہت قلیل حصہ ہے۔ سچائی یوں ہے کہ میں نے ۵ جولائی کو درگاہ عالیہ آثار شریف حضرت بل کے مغربی میدان میں ایک نہیں بلکہ دو تقریریں کیں۔ میری پہلی تقریر نماز جمعہ سے قبل دو بجے شروع ہو کر تین بجکر ۵ منٹ پر ختم ہوئی۔ تقریر کے وقت میں عین میدان کے آخری سرے پر دیوار کے قریب امام صاحب کے چبوترے پر کھڑا بول رہا تھا۔ اور سننے والوں کی صفیں وہاں سے لیکر ڈل کے کنارے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اور معراج شریف کا آخری جمعہ ہونے کے باعث حاضرین میں شہر سرینگر اور تمام صوبہ کے دیہات سے آئے ہوئے زائد از ایک لاکھ لوگ شامل تھے۔ میری اس تقریر کا بڑا حصہ لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ کونے کونے تک سنایا گیا۔ لیکن آخری منٹوں میں مشین کی خرابی کے باعث زیادہ دور بیٹھے ہوئے لوگ سننے سے محروم رہے۔

نماز کے بعد سوا چار بجے باغ کے وسطی چبوترے کو سٹیج بنا کر جلسہ کیا گیا۔ اس موقعہ پر میں نے تقریباً آدھ گھنٹہ یا چالیس منٹ تک ہی تقریر کی ہوگی۔ اس مقام پر لاؤڈ سپیکر کا انتظام نہ تھا۔ اور لوگ اس چبوترے کے چاروں طرف باغات میں پھیل کر سننے کی

کوشش کر رہے تھے۔ جلسوں کی اس کیفیت سے ظاہر ہے کہ استغاثہ صرف اسی دوسری تقریر کی بنا پر دائر کیا گیا ہے۔ جو وقت کی مقدار، مضمون کی ہیئت اور سامعین کی تعداد کے لحاظ سے پہلی تقریر کا مختصر سا ضمیمہ اور تتمہ تھی۔ اور اس تقریر کی جو رپورٹ عدالت میں پیش کی گئی ہے۔ وہ بھی نامکمل ہے۔ اور چند منتشر جملے ہیں۔ جو خود غمازی کرتے ہیں کہ ان کا سیاق و سباق نوٹ لینے والے کی دسترس سے دور رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود مجھے اعتراف ہے کہ یہ جملے میری تقریر کے ہیں۔ اور میرے مقصد کی دھندلی سی تصویر کے حامل ہیں۔

میری تقریروں کا خلاصہ

رپورٹر میرے مافی الضمیر کو عدالت تک پہنچانے سے قاصر رہے ہیں۔ تو میں اس کمی کی تلافی خود کر دیتا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ میری دونوں تقریروں کا مقصد اور مفہوم یہ تھا، کہ میں نے نیشنل کانفرنس کے مطالبہ آزادی اور نعرہ ہائے "کشمیر چھوڑ دو" اور "بیعنامہ امرتسر توڑ دو" کی وضاحت کے بعد عوام سے قربانی کی اپیل کی تھی۔ بالخصوص نماز کے بعد والی تقریر میں عوام کو میں نے بتایا تھا کہ ایک بے لگام اور شخصی حکومت کے سامنے سر جھکانا نہ صرف انسانیت کی تذلیل و توہین ہے بلکہ اسلام کی صحیح حریت آموز روح کے برخلاف ہے۔ اور مسلمان کا پہلا فرض ہے۔ کہ جب وہ لا الہ الا اللہ کہے۔ تو باقی بتوں اور طاغوتی طاقتوں کے ساتھ ساتھ ملوکیت کے بت سے بھی انکار کرے۔ میں نے انہیں اسلام کی تاریخ کا حوالہ دیکر بتایا تھا۔ کہ یزید ابن معاویہ خود مسلمان اور ایک جلیل القدر صحابی کا بیٹا تھا۔ مگر اس کی حکومت کے خلاف حضرت امام حسین علیہ السلام نے اس لئے بغاوت کی۔ کہ وہ نہ صرف بدعمل تھا۔ بلکہ حکومت کو وراثت پدری قرار دے کر اسلام میں ملوکیت کی ناپاک رسم کا بانی تھا اس لئے اگر کوئی مسلمان ملوکیت کے خلاف بغاوت نہ کرے۔ وہ سنت حسین سے روگردانی کا مجرم ہے۔

پاس شدہ تجاویز | میری تقریر کے بعد حاضرین جلسہ نے (جن کی تعداد کا اندازہ پولیس نے ۱۲ ہزار لگایا ہے۔ مگر غیر جانبداری سے کئی گنا زیادہ بتاتے ہیں)

میری استدعا پر بالاتفاق اعلان کیا۔ (۱) جموں و کشمیر پر مہاراجہ سر ہری سنگھ کی مطلق العنان حکومت کو تسلیم کرنے سے ہم انکار کرتے ہیں۔ (ب) مہاراجہ سر ہری سنگھ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے راج کی نسبت ریاست بھر میں حق رائے دہی بالغاں کے اصول کی بنا پر رائے اندازی کرائے۔ (ج) رائے اندازی کے بعد اگر ووٹوں کی اکثریت اس کے خلاف ہو۔ تو فوراً تخت سے دستبردار ہو جائے۔ کیونکہ ہم پورے یقین کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ وطن کے تمام سیاہ و سفید کی نسبت اقتدار اعلیٰ عوام کا حق ہے۔ اور اس کو وہی ادارہ استعمال کر سکتا ہے جس کو آزادانہ عوامی فیصلہ کے مطابق قوم نے مجاز بنایا ہو۔ (د) بیعنامہ امرتسر کی ہم مذمت کرتے ہیں۔ اور ڈوگرہ خاندان کے اس کی بنا پر قائم شدہ حق حکمرانی کو غاصبانہ تسلط یقین کرتے ہیں۔ اور اس بیعنامہ کی تنسیخ کا مطالبہ کرتے ہیں (ہ) عوامی استفسار کے نتیجہ میں اگر ووٹوں کی اکثریت مہاراجہ کو حکمران تسلیم کرنے کے حق میں ہو۔ تو ہمارا مطالبہ ہے کہ وہ صرف "آئینی حکمران" رہے۔ یہ تجاویز اور دیگر اسی قسم کے امور تھے جن کی نسبت اس جلسے میں شامل عوام بے پناہ سرگرمی دکھا رہے تھے۔ اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر متفقہ فیصلہ دے رہے تھے۔ اور پولیس کی ادھوری رپورٹیں یہ ظاہر کرتی ہیں۔ کہ رپورٹر لوگ یا تو تماشہ بینی کر رہے تھے۔ یا کسی وہم کے زیر اثر ہوش و حواس کو چھٹی پر بھیج کر خود "یا حفیظ" کا ورد کرنے میں مصروف تھے۔ اور بعد میں انہوں نے بنے بنائے جملوں کو رپورٹ قرار دے کر اپنے کاغذات کی خانہ پری کر دی ہے اور پولیس کا یہ سلوک نہ صرف اس جلسہ کی روئیداد کے ساتھ ہوا ہے۔ بلکہ نیشنل کانفرنس کی تمام کارروائیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوتا ہے۔

اعتراف جرم | بہر حال مجھے استغاثہ کے عائد کردہ کسی الزام سے انکار نہیں ہیں

اعتراف کرتا ہوں کہ اجتماع پر عائد کردہ پابندی کو توڑنا جلسہ کرنا۔ تقریر کرنا اور مہاراجہ ہری سنگھ کی مطلق العنانی کو چیلنج کرکے عوام کو جمہوری نظام کا راستہ بتانا اور یہ سب کچھ کر کے اپنے آپ کو گرفتاری اور سزا کے لئے پیش کر دینا ۵ر جولائی سنہ ۴۶ء کے دن میرے فرائض میں شامل تھا۔ اور میرے لئے یہ قابل فخر واقعہ ہے کہ میں نے اپنی بساط اور طاقت کے مطابق ان فرائض کو انجام دیا۔ استغاثہ بےچارہ زیادہ سے زیادہ یہی کہتا ہے اور یہ تو واقعات ہیں۔ اگر استغاثہ ان واقعات سے زائد بھی کوئی الزام مجھ پر عائد کرے۔ تو میں اس کی بھی تردید نہ کروں گا۔ کیونکہ بعض عاشقانہ منازل کا یہی تقاضا ہوتا ہے کہ "اعتراف گناہ نبودہ" بھی کیا جائے۔ تاکہ بے جا الزام لگانے والے منفعل نہ ہو جائیں۔

پھر کہتا ہوں کہ

میں اپنی اس تقریر میں بھی کہہ چکا ہوں۔ جس کی پاداش میں یہاں کھڑا کیا گیا ہوں۔ اور یہاں اس حقیقت کو پھر دہراتا ہوں کہ شخصی حکمرانی اور مطلق العنانی کے لئے اب زمان و مکان میں کوئی گنجائش نہیں۔ یعنے کائنات کی کائنات اب اس شخصی فرسودہ نظام کے خلاف ہے۔ جو کشمیر میں ابھی تک ہماری گردن کا پھندا بنا ہوا ہے۔ کرہ ارض پر ایک سرے سے دوسرے تک نظر ڈال کر دیکھئے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں ہر طرف دنیا میں بادشاہ ہی بادشاہ تھے۔ امریکہ نے سب سے پہلے اس بت کو توڑا۔ فرانس نے کچھ مدت کبھی انکار کبھی اقرار کیا۔ اور آخری فتح انکار کی ہوئی۔ اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے بادشاہوں کے سر سے تاج اس طرح گرنے لگے۔ جس طرح خزاں کے تیز و تند ہوا سے چنار کے پتے گرتے ہیں۔ آج دنیا کی سوا دو ارب آبادی میں سے پونے دو ارب انسانوں کا کوئی بادشاہ ہے ہی نہیں۔ جمہور کے اپنے منتخب کردہ صدر ہیں۔ جو ان کی عطا کردہ طاقت کا نشان ہیں۔ ایسی بے بادشاہ آبادیوں میں امریکہ، روس، یورپ کا اکثر حصہ اکثر ثقافتی ریاستیں ترکی اور چین وغیرہ

شامل ہیں۔ اور اب ہندوستانی (برطانوی ہندوستان کے ۳۲ کروڑ افراد) بھی ان میں شامل ہو جائیں گے۔ ۳۰ کروڑ کے لگ بھگ انسان برائے نام بادشاہوں کے ماتحت ہیں مگر عملاً وہ بھی آزاد و خود مختار ہیں۔ لے دے کر دنیا بھر میں تقریباً پندرہ کروڑ افراد ایسے بدقسمت رہ گئے ہیں جن کو مطلق العنانی بادشاہوں کی لعنت سے ابھی نجات نہیں ملی۔ اور ان میں سب سے بڑا حصہ یہی ہندوستان کے ۵۸۵ راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کی رعایا ہیں جن کی مجموعی تعداد نو کروڑ تیس لاکھ ہے اور ان ہی میں ہم ۴۰ لاکھ کشمیری بھی شامل ہیں

ناقابل انکار صداقت

جب باقی تمام دنیا کسی شاہ کجکلاہ، کسی نواب معلی القاب اور کسی مہاراج ادھیراج کے سایہ سے آزاد ہو جانے کے بعد ہی ترقی کر سکتی ہے۔ تو ہماری ترقی بھی اس سایہ سے آزاد ہو کر ہی ممکن ہو سکتی ہے یقین رکھئے کہ بادشاہ کے سایہ سے نجات تمام ذلتوں، پستیوں اور نحوستوں سے نجات کا دوسرا نام ہے۔ ایک معمولی سی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی جانتا ہے کہ برطانوی صوبہ جات اور دیسی ریاستوں کے عوام کی اقتصادی تعمیری، ذہنی اور سیاسی حالت کا مقابلہ کر کے دیکھا جائے۔ تو تمام ریاستی آبادیاں غیر ریاستی آبادیوں سے بدرجہا پسماندہ ہیں۔ اور یہ صورت کشمیر سے لیکر راس کماری تک یکساں ہے۔ ہم اپنے پڑوسی صوبوں سرحد اور پنجاب کے عوام سے ترقی کی دوڑ میں پیچھے ہیں۔ تو راجپوتانہ کی ریاستوں کے باشندے، یو۔پی، سی۔پی والوں اور دکنی ریاستوں کے باشندے مدراس وغیرہ جنوبی صوبجات کے باشندوں کے مقابلہ میں پچھڑے ہیں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ ہندوستان کی آب و ہوا، پیداوار، رنگ و نسل اور ذہنی ساخت ریاستی و غیر ریاستی دونوں میں مشترک ہے۔ ارتقائی مراحل میں ریاستی غیر ریاستی کے درمیان تفاوت کیوں؟ اس سوال کا جواب ہے کہ یہ تفاوت محض اس

سنئے ہے۔ کہ ہمارے سر پہ مطلق العنانیت کی نحوست سوار ہے۔ اور اب اس سے نجات کی صورت یہ ہے کہ ہم آٹو کریسی (Autocracy) کی اس متعفن لاش کو زیادہ دیر تک گلے سے چمٹائے نہ رہیں۔ اور ہمت کرکے اس کو دور پھینک دیں۔ بلکہ بہتر یہی ہے کہ اس کو کہیں زیر زمین دفن کردیں۔ کیونکہ گلی سڑی لاشوں کی جگہ زمین کی پیٹھ نہیں اس کا پیٹ ہے۔

۵۸۵ زار

اندازہ کیجئے کہ کل تک ہندوستان کو آزادی کی آخری قسط مل جائے گی۔ تو ۴۳ کروڑ آزاد ہندوستانیوں کا کوئی بھی بادشاہ نہ ہوگا۔ اور اس وقت جارج ششم کی جو برائے نام بادشاہت وہاں محسوس کی جا رہی ہے۔ وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ مگر ہم نو کروڑ تئیس لاکھ بدقسمت ریاستی انسانوں کی گردنوں پہ ایک، دو، دس، بیس نہیں اکٹھے ۵۸۵ بادشاہ سوار ہوں گے۔ خدائی پناہ یہ بادشاہوں کی پوری ایک رجمنٹ ہے۔ جس کو اگر ساری دنیا پر تقسیم کیا جائے۔ تو بھی ان کے لئے گنجائش نہ نکلے گی۔ ۱۸۰ کروڑ روسی ایک زار کو نہ پال سکے۔ اور مجبور ہوئے کہ نہ صرف شاہی نظام کو ہی ہمیشہ کے لئے ختم کریں۔ بلکہ زار کی نسل اور خاندان تک کا نام و نشان مٹا دیں۔ مگر ایک طرف ہم یہاں سوا نو کروڑ سخت جان ریاستی ہندوستانی ہیں۔ جو پورے ۵۸۵ زاروں کی پرورش اپنے خون سے کر رہے ہیں۔ اور ان میں سے بعض ہمارے خون کی کمائی پہ جس شان و شوکت سے رہتے سہتے ہیں۔ اور عیاشانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے سامنے زار کی زاریت اور قیصر کی قیصریت بھی پانی بھرتی نظر آتی ہے۔ قطع نظر اس امر کے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران میں ہندوستان کے ان ۵۸۵ "سپوتوں" کے آباؤاجداد نے مادر وطن کو سات سمندر پار کے امپیریلزم کی لونڈی بنانے میں کیا کارنامے سرانجام دئیے۔ اور ہندوستان کی غلامی کے دور میں باقی ہموطنوں اور خود اپنی رعایا کے ساتھ ان کی روش کیا رہی۔ اور اب آزادی کی جدوجہد کے دوران میں موجودہ مہاراجوں اور نوابوں کی اکثریت کو "شاندار کارنامے"

انجام دیتی رہی ہے۔ آئندہ کے لئے ہم جو نظام تصور میں لا رہے ہیں۔ اس میں یہ حضرات کہیں کھپتے نظر نہیں آتے۔ مولانا حالی نے اپنے وقت کے استخوان نبید اور ننگ باز شاعروں کی خدمت میں فرمایا تھا کہ ؎

کریں کوچ دنیا سے شاعر ہمارے
کہیں مل کے "خس کم جہاں پاک" سارے

مولانا حالی کے وقت کے شاعر بلا استثناء اس فیصلے کے مستحق ہوں تو ہوں۔ مگر آج ہندوستان کے شاعروں میں ہزاروں خوبیاں ہیں۔ اور اقبال، ٹیگور، چکبست، نذر الاسلام اور جوش وغیرہ کی شاعری نے نہ صرف مولانا حالی کی اس "ہول سیل" مذمت کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ بلکہ ان بزرگوں نے اپنے شاعرانہ کمال سے ہندوستان کی شاعری کو عالمگیر ادبیات کی پہلی صف میں جگہ دلا کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہندوستانی قوم کا انتہائی ضروری اور قابل فخر عنصر ہیں۔ البتہ ہمارے راجے مہاراجے اور نواب اگر باہمی تعاون و اشتراک کر کے بیک وقت متفقہ طور سے اس دنیا سے انتقال فرما جائیں۔ تو ہر ایک جمہوریت پرست کی زبان بے ساختہ پکار اٹھیگی کہ "خس کم جہاں پاک" کیونکہ آزاد ہندوستان کی قومی زندگی میں ان "شاہان عالی وقار و مہاراجگان ذی اقتدار" کا کوئی مصرف نہیں۔

زمانہ یعنی وقت کا فیصلہ

اور پھر یہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل بات نہیں کہ زمانہ دنیا سے شہنشاہیت کے ادارے کو تیزی کے ساتھ ختم کر رہا ہے۔ جاپانیوں میں پورے ۲۶ سو سال سے ایک ہی خاندان کی بادشاہت چلی آ رہی تھی۔ اور وہ لوگ بادشاہ کو عملاً خدا مانتے تھے۔ مگر آج اس خاندان کی آخری نشانی "ہیرو ھیتو میکاڈو" کی خدائی تو ایک طرف رہی۔ بے چارے کے پاس معمولی حکمرانی

کا پورا اعزاز، اختیار بھی باقی نہیں ہے۔ اور وہ جنرل میکارتھر کے اشارہ چشم و ابرو پر ایک بے جان کٹھ پتلی کی طرح ناچنے پر مجبور ہے۔ اور تعجب نہ ہوگا، اگر عنقریب اس کو جنگی مجرم کی حیثیت سے کسی جنگی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے۔

ان حالات سے ظاہر ہے کہ ان راجوں اور مہاراجوں کو اگر ہم قائم بھی رکھنا چاہیں تو وقت ان کو نہیں رکھنا چاہتا۔ لہذا یہ عوام کی ترقی کو التوا میں ڈال کر اور ملک کو نقصان پہنچا کر بھی جب ختم ہی ہوں گے۔ تو بہتر ہے کہ شاہیت کے فرسودہ ادارے کو ختم کر کے ابھی سے رضاکارانہ طور پر اپنے تخت و تاج سے دستبردار ہو جائیں۔ ایسا کرنا ان کے لئے ایک باعزت اقدام اور ملک کے لئے موجب آسائش ہوگا۔

والیانِ ریاست کا اخلاقی تنزل

یہ ایک مانا ہوا اصول ہے کہ قیام و دوام صرف اسی چیز کو حاصل ہوتا ہے۔ جو اپنے عناصر کے لحاظ سے پختہ اور فوائد میں بڑھ چڑھ کر ہو۔ راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کی مطلق العنانی کا اہم ترین فعال عنصر ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے گورنروں کے ساتھ کئے ہوئے ان کے وہ معاہدے اور سندات ہیں۔ جو انگریز کے جانے کے بعد ردی کے بھاؤ بکنے کے قابل بھی نہیں۔ اور ان والیان ریاست کے وجود سے ملک کو فوائد کیا ہیں؟ یہ ان کی ذاتی قابلیتوں، طرز عمل، اخلاقی حالت اور کارناموں کا جائزہ لینے سے بخوبی واضح ہو سکتا ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ ان کا طرز حکومت جاگیردارانہ، جابرانہ اور ظالمانہ ہے۔ ان کی ذاتی زندگیاں عیاشانہ ہی نہیں۔ بلکہ مجرمانہ حد تک گھناؤنی ہیں۔ ۵۰ء۵ میں اکثر اخلاقی اعتبار سے اس قابل بھی نہیں کہ کسی مہذب ملک کے شریف شہریوں کے زمرے میں بھی شامل کئے جا سکیں۔ چہ جائیکہ انہی لاکھوں بندگان خدا پر حکمران بنا کر ان کی جان و مال ان کے رحم و کرم چھوڑ دئے جائیں۔ جو ضابطہ ہائے قانون خود ان کے دستخطوں سے قانونی رتبہ حاصل کرتے ہیں۔ ان میں درج شدہ

قابل دست اندازی پولیس جرائم کا ارتکاب یہ خود شب و روز کرتے ہیں۔ اور اس کے باوجود چاہتے ہیں کہ عوام ان کی حکومت کو خدائی حکومت اور ان کے وجود کو "ظل اللہ" اور "بھگوان کا روپ" تصور کر کے ان کی بدکاریوں سے آنکھیں بند کر لیں۔ اور ان کے خلاف بغاوت تو کجا لب کشائی کو بھی خدائی عذاب کا موجب یقین کریں۔ انتہا تو یہ ہے کہ ان کی بدنیتی اس درجہ تک پہنچی ہے کہ غیر ملکی انگریز جو اصلاحات آج سے برسوں پہلے ہندوستان کو دے چکا تھا یہ ان کا عشر عشیر آج بھی اپنی رعایا کو دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اپنی رجعت پسندی کی وجہ سے یہ خود دقیانوسی زمانہ کی یادگار بنے ہی۔ مگر اب چاہتے ہیں کہ ان کی رعایا بھی آج سے ہزار بارہ سو سال پہلے کی اندھی، بہری اور گونگی رعایا بن جائے۔ ایسی حالت میں زمین اس ناپاک بوجھ کو کب تک گھسیٹتی پھرے گی۔ کوئی ماں بھی اپنے مردہ بچے کی لاش کو چند گھنٹوں سے زیادہ گود میں نہیں رکھ سکتی۔

باہمہ مطالبہ معتدل ہے

گو تاریخ، فلسفہ، اخلاق، مذہب اور پھر سب سے بڑھ کر وقت کے ناگزیر تقاضے ایک ہی فیصلہ دیتے ہیں۔ کہ راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کے لئے مستقبل کے ہندوستان میں گنجائش نہیں۔ لیکن اس کے باوجود پرامن فیصلہ کرنے کے لئے آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس جس اصول کو پیش کر رہی ہے۔ وہ ایسا معتدل اصول ہے جس پر عمل کر کے آئینی حکمران کی حیثیت میں بعض مقابلتاً کم بڑے راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کا باقی رہنا ممکن ہے۔ اور نیشنل کانفرنس کا پیش کردہ یہ اصول رائے عامہ سے استصواب کا اصول ہے جس کی صورت میں ہر وہ والی ریاست جس نے اپنے نیک اعمال سے لوگوں کا اعتماد حاصل کر لیا ہو۔ عوام کی اکثریت کی تائید حاصل کر کے آئینی حکمران کے طور پر اپنے تخت پر قائم رہ سکتا ہے۔

مہاراجہ کشمیر سے مطالبہ

مہاراجہ ہری سنگھ سے بھی پھر استصواب عام کے مطابق چلنے

کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اور یہ کوئی نرالا مطالبہ نہیں۔ اس پر اس وقت مہذب دنیا میں ہر طرف عمل ہو رہا ہے۔ آج سے تین ماہ پہلے اٹلی میں بادشاہ کی نسبت رائے عامہ کا استفسار ہوا۔ اکثریت بادشاہ کے خلاف رہی۔ ابھی ووٹ گنے جا رہے تھے کہ بادشاہ اٹلی کو چھوڑ کر پرتگال چلا گیا۔ پچھلے مہینے بلغاریہ میں بھی ایسا ہوا۔ اور ووٹوں کی اکثریت نے بادشاہ کو تخت سے دستبردار کرا دیا۔ اور ابھی گذشتہ ہفتے یونان کا بادشاہ محض اس لئے وطن پہنچکر تخت نشین ہوا ہے۔ کیونکہ عوامی استفسار میں رائے اندازی کے نتیجہ نے اس کو یہ حق دیا تھا۔ جب اٹلی، یونان اور بلغاریہ میں شاہیت اور جمہوریت کی کشمکش کا پر امن فیصلہ عوامی ووٹوں سے ہو سکتا ہے تو کشمیر میں بھی ایسا ہی کیوں نہ ہو۔ آخر کسی اصول پر فیصلہ ہونا ہے۔ تو قتل و غارت، قید و بند کے مقابلہ میں استفسار عامہ کے اصول میں کیا برائی ہے۔

کیا اصول منظور ہے؟ جس روز میں تقریر کرنے کے "ناقابل عفو جرم" کے لئے آپ کے سامنے جوابدہ ہو رہا ہوں۔ اور جس دن جلسے میں مہاراجہ ہری سنگھ سے عوام نے مطالبہ کیا تھا کہ وہ رائے عامہ سے استفسار کر لیں۔ اس کے دس دن بعد یعنے ۱۵ جولائی ۱۹۴۶ء کو گپکار میں مہاراجہ سر ہری سنگھ نے ایک عام دربار منعقد کیا۔ (جس میں بتایا جاتا ہے کہ اکثریت چوکیداروں کی تھی۔ بہر صورت جو کوئی بھی ہو) رپورٹوں سے ظاہر ہے کہ حاضرین نے اس دربار میں مہاراجہ صاحب کی حمایت کا اعلان کیا۔ اور مہاراجہ نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ بالفاظ دیگر مہاراجہ نے دربار بازی کے ذریعہ بخیال خود اپنی تائید میں رائے عامہ کا ثبوت دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کے علاوہ بعض جاگیرداروں سے مہاراجہ کے حق میں بیان بھی دلائے گئے ہیں۔ جو محکمہ نشر و اشاعت کی جانب سے بڑے ہی اہتمام کے ساتھ شائع کئے گئے ہیں۔ بیانات اور یہ دربار فیصلہ کن نہ ہونے کے باوجود میرے نزدیک قابل اعتراض نہیں۔ کیونکہ بیانات دینے والے جاگیردار اور دربار میں شامل ہونے والے چوکیدار

بھی بحیثیت باشندہ ریاست حق رکھتے ہیں کہ استصواب کے وقت شاہیت کی حمایت یا مخالفت میں ہاتھ اٹھائیں۔ باوجودیکہ ان سے حاصل کی ہوئی رائے ملک کے عام جمہوری استصواب کی صورت میں نہ تھی۔ تاہم ان کی اس رائے کی میں اسی طرح قدر کرتا ہوں جس طرح حضرت بل کے ۵ رجولائی والے جلسے کے ہزارہا شرکا کی اس رائے کی مجھے عزت ہے۔ جو انہوں نے شاہیت کے خلاف استعمال کی۔ اور اس دربار اور ان بیانات کو میں اس لئے بھی اہم قرار دیتا ہوں کہ ان اقدامات نے ایک ایسا نیا مرحلہ طے کر لیا ہے۔ جس کا طے ہونا تحریک حریت کے منزل مقصود کے قریب جانے کے لئے ضروری ہے۔ اور وہ مرحلہ رائے عامہ کے اصول کو فیصلہ کن معیار مان لینے کا مرحلہ ہے۔ میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ مہاراجہ ہری سنگھ نے رائے عامہ کے اصول کو مندرجہ صدر اقدامات سے دانستہ یا نادانستہ مان لیا ہے۔ اور میرے خیال کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ دربار چوکیداروں اور جاگیرداروں کی تائید کو محکمہ اطلاعات نے اس مقصد کے لئے اشاعت دی کہ یہ کشمیر کے عوام کا فیصلہ ہے۔ جو نیشنل کانفرنس اور شیخ محمد عبداللہ کے مطالبات کے خلاف اور مہاراجہ کے حق میں ہے۔

آئیے میدان میں

اب راستہ مختصر ہے۔ ہم رائے عامہ کو معیار بناتے ہیں۔ آپ چوکیداروں اور جاگیرداروں کے کہنے پر رائے عامہ کو اپنی تائید میں ہونے کا دعوے کرتے ہیں۔ تو صاف بات یہ ہے کہ اس کے اصول اور معیار ہونے کی نسبت آپ کو بھی انکار نہیں۔ اصول پر اتفاق کے بعد متنازعہ امر یہ رہ جاتا ہے کہ استصواب کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ جاگیردار، ذیلدار چوکیدار نمبردار وغیرہ لوگ جو مفاد خصوصی کے نمائندے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی عوام کی رائے کا ترجمان نہیں۔ عوام کی رائے وہی ہوگی۔ جو براہ راست ووٹ اندازی سے معلوم کی جائے۔ اس پر متفق ہونے میں آپ کو کیا عذر ہے؟ جب آپ کو یقین ہے کہ ملک کی اکثریت آپ کے ساتھ ہے۔ تو اس مطالبہ کو لبیک کہئے۔

اور اگر آپ رائے عامہ معلوم کرنے کے صحیح طریقہ سے انکار کرتے ہیں۔ اور جاگیرداروں کے بیانات اور چوکیدارہ دربارہ کو عوام کی تائید کے طور سے دنیا میں پیش بھی کرتے ہیں۔ تو یہ خود غرضانہ عیاری کہلائے گی۔ اور اس سے آپ عوام کے مطالبۂ آزادی کو کمزور کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ اور ایک دن آئے گا۔ جب آپ کو وہ اصول ماننا پڑے گا جو نیشنل کانفرنس پیش کر رہی ہے لیکن آج آپ اس اصول کو تسلیم کرلیں۔ تو عوام سے زیادہ آپ کو فائدہ رہے گا۔

واحد قابل عمل اصول آخر میں یہ کہہ دوں کہ کشمیر چھوڑ دو کا نعرہ جس عوامی مطالبے کی ترجمانی کرتا ہے۔ ہمارے اس مطالبے کی کامیابی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ آئندہ کے لئے جو واحد قابل عمل صورت آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس پیش کر رہی ہے۔ اس کے سوا والیان ریاست اور عوام کے درمیان پیدا شدہ کشمکش کا کوئی حل ہے ہی نہیں۔ اور والیان ریاست کی طاقت سے یہ بات باہر ہے کہ وہ اپنی ریاستوں میں آزادی کی قوتوں کو بزور شمشیر کچل کر اپنی مطلق العنانی کو قائم رکھ سکیں۔ بالخصوص مہاراجہ ہری سنگھ کے لئے تو یہ قطعاً ناممکن ہے کہ وہ "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک کو ناکام بنا سکے۔

انگریز مدد کو نہیں پہنچ سکتا اب تک ریاستوں میں عوامی تحریکوں کو دبانے کے لئے حکومت برطانیہ سے مدد لی جاتی تھی۔ خود اس ریاست کشمیر میں بھی سنہ ۱۹۳۱ء کے انقلاب کو دبانے کے لئے انگریزی افواج جموں اور میرپور میں لائی گئیں۔ اور احرار کے جتھوں سے تو مہاراجہ ہری سنگھ کو اس وقت تک نجات نہ ہو سکی جب تک گورنر پنجاب نے ریاستوں کے بچاؤ کے لئے آرڈیننس کے تحت پنجاب میں ہی احرار کی گرفتاریاں شروع نہ کر دیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عوامی تحریکات کے مقابلے کے لئے ریاستیں خود کفایت (self sufficent) نہیں ہیں۔ مگر اب انگلستان

سے تو ان کی امداد کو فوجیں بھیجکر انگریز ان کو رعایا کے مطالبوں سے بچا نہیں سکتا۔ اگر میجر اٹیلی اور مسٹر بیوان کی جگہ زمام اختیارات مسٹر چرچل اور ہٹلر کے ہاتھ میں دی جائے۔ تو بھی حکومت برطانیہ کی جانب سے والیانِ ریاست کی فوجی اعانت ناممکن ہے۔

لہذا قومی تحریکوں کا مقابلہ کرنے کے لئے انہیں کوئی اور صورت سوچنی ہوگی۔ باقی اب صرف دو ممکن صورتیں سامنے آسکتی ہیں۔

(۱) ہندوستان کی قومی حکومت کی امداد۔

(۲) مہاراجوں اور نوابوں کی باہمی امداد و تعاون۔

مرکزی اعانت سے محروم

جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے۔ وہ خارج از بحث ہے۔ کوئی ہندوستانی قومی حکومت مہاراجوں اور نوابوں کی شخصی بے لگام حکومتوں کی حمایت نہیں کر سکتی۔ اور ہندوستان کی سب سے بڑی پارٹی تو ان کو ابھی سے بار بار نوٹس دے چکی ہے کہ اختیارات و اقتدار لوگوں کو سونپ کر ان کی مرضی سے آئینی حکمران بن جاؤ۔ لہذا جب اس سوال پہ والیان ریاست کی ٹکر اپنی رعایا سے ہوگی تو قومی حکومت ان کی حمایت نہیں کرے گی۔ اور اگر کوئی حکومت ایسی غلطی کرے۔ تو آزاد ہند کی رائے عامہ دوسرے دن اس کو ختم کر دیگی۔

باہمی تعاون ناممکن

اب رہی دوسری صورت کہ عوام کے خلاف ایک ریاست دوسری ریاست کی فوجی امداد کرے۔ یہ صورت قطعاً ناممکن ہے چھوٹی ریاستوں کے پاس تو فوجیں ہیں ہی کہاں۔ رہی بڑی بڑی خرانٹ ریاستیں۔ تو ان کی سرحدیں ایک دوسرے سے عموماً جدا ہیں جب تک آزاد ہندوستان کے کسی علاقے سے ان کی فوج نہ گذرے۔ وہ دوسری ریاست میں پہنچائی نہیں جا سکتی۔ اور آزاد ہندوستان ایسی فوجوں کو کیوں گذرنے دے گا۔ جو نہتے عوام پہ گولیاں برسانے

جا رہی ہوں۔ اور اگر کوئی والیٔ ریاست یہ بھی سمجھتا ہے کہ مرکز کے ساتھ ریاستوں کے نئے معاہدے کے وقت رعایا کے خلاف حکمران کی جارحانہ کارروائیوں میں امداد کی شرائط تسلیم ہوں گی۔ تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔

بے یارومددگار باطل

اس سے صاف ظاہر ہے (۱) کہ کوئی ریاست خود بخود تحریک آزادی کو دبا نہیں سکتی۔ (۲) انگریز ان میں سے کسی کو مدد نہیں کر سکتا۔ (۳) مرکزی حکومت ان کی مدد نہیں کرے گی۔ (۴) ایک ریاست دوسری ریاست کی مدد کو نہیں آ سکتی (۵) نئے معاہدات میں ایسا کوئی انتظام خارج از بحث ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آخرکار ہر ایک والیٔ ریاست نے عوام کی ایسی تحریکوں سے بطور خود دوچار ہونا ہے۔ جن کا انجام عوام کی کامیابی اور حکمران کی ناکامی پر ہوگا۔ لہٰذا کیا یہ دانشمندی نہیں کہ عوامی مطالبات پر امن طریقہ سے منظور کر لئے جائیں؟

بہرصورت اس سوال کا جواب کوئی والیٔ ریاست یا اس کا مشیر ہی دے گا نیشنل کانفرنس کو اس سے غرض نہیں۔

نیشنل کانفرنس کا تاریخی فرض

نیشنل کانفرنس کا تاریخی فرض یہ تھا کہ وہ عوام کی آزادی کے مطالبہ کو آخری شکل و صورت میں سامنے لائے۔ اور اس کے حصول کے لئے ہر ایک ابتلا کو دعوت دے۔ اس فرض کو اس نے ادا کیا۔ میں جو اس کانفرنس کا جنرل سکریٹری اور ادنیٰ خادم ہوں۔ میں نے بھی ۵ جولائی کو یہی فرض انجام دیا۔ اور سب کچھ سمجھ بوجھ کر انجام دیا۔ اپنے خلاف پیش کردہ الزامات کی اس قدر وضاحت کو میں کافی سمجھتا ہوں۔ اس وضاحت کو سن لینے کے بعد اب آپ (عدالت) اپنا فرض انجام دیجئے۔ اس سے زیادہ کہنے کی گنجائش نہیں۔

سماعت کے دوران میں آپ کے اور استغاثہ کے نمائندہ دوستوں کے بلند اخلاقانہ رویہ نے مجھے مرہون منت کیا ہے۔ اور میرے قانونی مشیر اور دوست مسٹر محمد لطیف قریشی ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی کی محنت اور زحمت کشی نے میرے دل پر احسانات کا کبھی نہ مٹنے والا اثر چھوڑا ہے۔ جس کا شکریہ ادا کرنے کے بغیر

اگر یہ سطور ختم ہو گئیں۔ تو میں اپنے ایک اہم فرض سے قاصر رہوں گا۔ ان الفاظ کے ساتھ اس بیان کو ختم کرتا ہوں۔ اور اپنے نعروں کا اعادہ کرتا ہوں کہ "نیشنل کانفرنس زندہ باد"۔ "شیر کشمیر زندہ باد"۔ "کشمیر کو چھوڑ دو"۔ "بیعنامہ امرتسر کو توڑ دو"۔ "اقتدار و اختیار عوام کا حق ہے"۔ فقط

تحریر ۱۵؍اکتوبر سنہ ۱۹۴۶ء

محمد سعید مسعودی

جنرل سکریٹری آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس

نقل فیصلہ

از عدالت چوہدری اندو بھوشن صاحب ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی سٹی منصف۔ مجسٹریٹ درجہ اول۔ سرینگر

فوجداری کیس نمبر ۱۵ ب ۱۳ سنہ ۲

سرکار بنام (۱) مولوی محمد سعید ولد مولوی احمد شاہ ساکن سرینگر

(۲) غلام محمد ولد جمال بٹ ساکن درگجن۔ سرینگر

(۳) حکیم قاسم علی ساکن باباپورہ زیر وارنٹ مطابق ۵۱۲ ضابطہ فوجداری۔

چالان زیر دفعہ ۳۲ و ۵۰ جموں و کشمیر ڈیفنس رولز

پیروکار منجانب سرکار:۔ مسٹر محمد رجب کورٹ انسپکٹر

پیروکار منجانب ملزماں:۔ مسٹر عبداللطیف قریشی ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی وکیل

۲۲ مارچ ۱۳ سنہ ۲ کو معراج عالم کے بعد جمعہ کے روز زیارت حضرت بل میں پچاس ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان اشخاص نماز ادا کرنے کے لیئے جمع ہوئے۔ بیان استغاثہ کے مطابق تین ملزموں نے اس روز زیارت میں تقریریں کیں۔ ملزم قاسم علی روپوش ہے۔ اور ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۵۱۲ کے تحت اس کے خلاف شہادت قلمبند کی گئی ہے۔ یہ چالان صدر پولیس سٹیشن کی طرف سے جموں و کشمیر ڈیفنس رولز کی دفعات ۲۸، ۳۲ اور ۵۰ کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ اس روز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے زیر دفعہ ۵۰ جموں و کشمیر ڈیفنس رولز پانچ اشخاص سے زائد پر مشتمل مجمع کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

علی میر کانسٹبل، ناتھ جی ہیڈ کانسٹبل، بلہ باقر نمبردار، علاؤالدین رپورٹر اور بارج سنگھ سب انسپکٹر نے استغاثہ کی طرف سے شہادتیں دیں۔ دو ملزموں نے میرے سامنے جو بیانات دیئے۔ وہ قلمبند کیئے گئے ہیں۔ ملزم مولوی محمد سعید جو نیشنل کانفرنس کے جنرل سکرٹری ہیں۔

نے تسلیم کیا ہے کہ اُس نے اُس روز دو تقریریں کی ہیں۔ دوسرے ملزم نے اپنے بیان میں بتایا کہ اس نے نہ کوئی تقریر کی۔ اور نہ نعرہ لگایا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اس وقت حاضر نہ تھا۔ اور یہ کہ پولیس نے اس کو اس چالان میں محض اس وجہ سے شامل کیا۔ کیونکہ اسے اگلے روز گرفتار کیا گیا تھا۔ اور مذکورہ تقریر کے بعد مبینہ جلوس میں اس کی شمولیت کے سلسلہ میں اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ دونوں ملزموں کے خلاف زیر دفعات پچاس و تیس جموں و کشمیر ڈیفنس رولز فرد جرم لگا دی گئی ہے۔ ملزم ۱ نے اپنے بیان میں جو پچاس صفحات پر مشتمل ہے، الزام کا اقرار کیا ہے ملزم غلام محمد نے جرم تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ اور اس نے کوئی صفائی پیش نہ کی۔

سہولت کے پیش نظر میں ملزم غلام محمد کے کیس کو پہلے لوں گا۔ علی میر اور ناتھ جی شاہدوں نے اپنے بیانات میں بتایا کہ ملزم نے ملزم مولوی محمد سعید کی تقریر کے دوران میں اور اختتام پر نعرے لگائے۔ کوئی دلیل ایسی پیش نہیں کی گئی۔ جو مجھے شہادت کو جھوٹ ماننے پر آمادہ کرتی۔ سٹیج پر محض اس کی حاضری ہی اس کو دفعہ ۵۰ کی زد میں لاتی ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس کی تقریر میرے سامنے نہیں ہے۔ میں اس کو دفعہ ۳۲ کے تحت سزا دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ لہذا میں اس کو جموں و کشمیر ڈیفنس رولز کی دفعہ ۵۰ کے تحت مجرم پاتا ہوں۔ اور اس کو ایک ماہ قید سخت کی سزا دیتا ہوں۔ میں نے ابھی اس کو اسی روز کے واقعات پر مبنی ایک اور کیس میں سزا دی ہے۔ ملزم کی دونوں سزائیں اکٹھی شروع ہوں گی۔

مولوی محمد سعید کے بیان کے پیش نظر یہ ضروری نہیں کہ اس کے خلاف پیش شدہ شہادتوں کا حوالہ دیا جائے۔ اپنے تحریری بیان میں وہ کہتے ہیں کہ اپنے بیان سے وہ استغاثہ کی کافی مدد کریں گے۔ اور اپنے اسی بیان کے صفحہ ۵ پر وہ تسلیم کرتے ہیں کہ رپورٹر کی رپورٹ (EXP. B) میں اس کی سالم تقریر نہیں بلکہ کچھ حصہ درج ہے مگر ساتھ ہی وہ رپورٹ کے کسی حصہ سے انکار نہیں کرتے۔ رپورٹر نے یہ نوٹ لانگ ہینڈ میں لئے تھے۔ اور یہ نماز کے بعد کی تقریر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ملزم نے نماز سے پہلے بھی ایک تقریر

کی۔ اور جیسا کہ وہ اپنے تحریری بیان میں اقرار کرتا ہے۔ یہ دوسری تقریر جس کے نوٹ لیے گئے ہیں۔ اس کی پہلی تقریر کا ایک خلاصہ اور ضمیمہ تھی۔ اس مقدمہ کے مقصد کے لیے جو کچھ اس نے نماز سے پہلے اور بعد میں کہا۔ ایک ہی تقریر کے حصے مانے جا سکتے ہیں جس میں نماز کا وقفہ آنا لازمی تھا۔ رپورٹ کا خلاصہ (EXP. B) یہ ہے کہ ملزم نے کہا کہ عوام مہاراجہ بہادر کی حکومت سے خوش نہیں ہیں۔ اور یہ کہ اگر مہاراجہ بہادر خود کو اس امر کے متعلق اطمینان دلانا چاہتے ہیں۔ تو اس کے لئے صرف یہ ضروری ہے کہ عوام سے ایک استفسار یہ لیا جائے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ڈوگرے اور سی۔ آئی۔ ڈی کے ملازم تک بھی مہاراجہ بہادر کی حکومت سے بیزار ہیں۔ آخر میں مقرر نے مجمع سے اپیل کی کہ وہ احکام کی خلاف ورزی کو جاری رکھیں۔ جلوس نکالیں۔ اور اپنے نصب العین کے لئے قربانیاں دیں۔ اس رپورٹ کے کسی بھی حصہ سے ملزم نے انکار نہیں کیا۔

اس مقصد کے پیش نظر ملزم کے تحریری بیان کے بہت حصے متعلقہ نہیں قرار دے جا سکتے۔ ملزم کا یہ بیان اکبر اعظم کے عہد کی تاریخ کشمیر سے شروع ہوتا ہے۔ اور آج تک کے تاریخی اور سیاسی تغیرات کا خاکہ کھینچنے کے بعد ملزم نے سنہ ۱۸۴۶ء کے عہد نامہ امرتسر پر کافی زور ڈالا ہے۔ ملزم نے اس کو "بیعنامہ" کے نام سے پکارا ہے۔ اس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس کے علم کے مطابق لوگوں کو وقتاً فوقتاً کن کن تکالیف کو برداشت کرنا پڑا ہے۔ ڈوگرہ عہد حکومت کا تذکرہ کرتے ہوئے ملزم نے یہ دکھایا ہے کہ اس دور کے امتیازی خصوصیات غیر حاضر زمینداری، سود خواری اور سرکاری ملازموں کی رشوت ستانی ہیں۔ آگے چل کر ملزم نے بتایا ہے کہ لوگوں کی تعلیمی اور صنعتی پسماندگی کا سبب کشمیر پر چار صدیوں کا بیرونی تسلط ہے۔ پھر ملزم بیان کرتا ہے کہ برطانوی ہندوستان کے ہمسایہ علاقوں میں کارفرما طاقتوں اور وقوع پذیر حالات سے متاثر ہو کر کشمیر بھی سیاسی غنودگی سے بیدار ہوا۔ ملزم کی رائے میں عوام کو ایک رہنما کی ضرورت تھی۔ اور انہیں وہ شیخ محمد عبداللہ کی ذات میں ملا۔ اور ملزم کے خیال کے مطابق کشمیری عوام اس کی قیادت میں بار بار بغاوت کر چکے ہیں۔ اس نے شیخ محمد عبداللہ کی رہنمائی کی تعریف کی ہے۔ اور جتلایا ہے کہ سنہ ۱۹۳۱ء میں بھی اس کا مقصد

وہی تھا جو آج ہے . یعنے عوام کی آزادی . آگے جاکر ملزم نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ "نیا کشمیر" (جو نیشنل کانفرنس نے ریاست کے لئے بطور ایک دستور اساسی تجویز کیا تھا) اور "کشمیر کو چھوڑ دو" (جو کہ نیشنل کانفرنس نے کیبنٹ مشن کو بطور میمورنڈم پیش کیا تھا) میں کوئی تضاد نہیں . اس دستاویز میں عہد نامہ امرتسر کے جواز پر اعتراض کیا گیا تھا . اور یہ بتایا گیا تھا کہ چونکہ ڈوگرہ خاندان نے کشمیر میں اس ناجائز عہد نامہ کی بنا پر اقتدار حاصل کیا ہے . اس لئے ڈوگرہ خاندان کو چاہیئے کہ وہ کشمیر کو چھوڑ کر لوگوں کو آزادانہ طور اپنی حکومت آپ کرنے دے . ملزم تسلیم کرتا ہے کہ "نیا کشمیر" میں تجویز کیا گیا تھا کہ ہز ہائینس کو آئینی حکمران کی حیثیت میں برقرار رکھا جائے گا . اور یہ بھی مان لیا ہے کہ "کشمیر چھوڑ دو" نامی دستاویز میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ حکمران صرف اسی صورت میں آئینی حکمران رہے گا . اگر اسے عوام کی رضامندی اور تائید حاصل ہو . بیان کے باقی حصے میں ملزم نے حکومت پر مختلف الزامات عائد کئے ہیں . اور یہ رائے ظاہر کی ہے کہ نیشنل کانفرنس اس لئے موجودہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی . کیونکہ موجودہ پرائم منسٹر نے اس پر تشدد اور سختی روا رکھی . تاہم اُسے نیشنل کانفرنس کی موجودہ اختیار کردہ پالیسی سے بنیادی اتفاق ہے . اور اس کا دعویٰ ہے کہ نیشنل کانفرنس ان حالات کو پیدا کرنے کے لئے گورنمنٹ کی شکر گذار ہے . جن کی وجہ سے یہ تبدیلی رونما ہوئی . اس کا خیال ہے کہ نیشنل کانفرنس نے جو تحریک شروع کی . اس کی وجہ سے اس نے ریاست کے اندر اور باہر ہمدردی حاصل کی ہے . بیان کا خاتمہ ہندوستان کے شاہزادگان کی عام معزولی کے مطالبہ کے ساتھ ہوتا ہے .

اپنے بیان کے ضمیمہ میں ، جو میں نے اس کے تحریری بیان پڑھے جانے کے بعد قلمبند کیا ، اس نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک قسم کی آئینی سرداری کا مخالف نہیں ہے . اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ آیا وہ "ڈوگرہ راج مردہ باد" ایسے نعرے لگائے جانے کو بنظر استحسان دیکھتا ہے یا نہیں . اس نے بتایا کہ گو وہ نعرے کے الفاظ کو اپنا نہیں سکتا . تاہم ایسا نعرہ لگانے میں وہ لوگوں کو حق بجانب تصور کرتا ہے .

جیسا کہ میں نے شروع میں بیان کیا۔ اس کے بیان کے بہت حصے اس مقدمہ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ اس لئے میں ضروری نہیں سمجھتا کہ ریاست کی تاریخ کے بارے میں اس کے ساتھ کوئی بحث چھیڑوں۔ یا ڈوگرہ راج کے خلاف اس کے الزامات کا جواب دے دوں۔ میں مختصراً اس کے بیان کے اس حصے پر رائے زنی کروں گا [illegible] دیا کشمیر کے موجودہ نظام حکومت پر نکتہ چینی پر مشتمل ہے۔ کیونکہ لازمی حد تک [illegible] رائے زنی اس کے جرم یا بے گناہی کے تعین کے لئے ضروری ہے۔ جیسا کہ اس نے خود ظاہر کیا ہے۔ اس کا پیش کردہ بیان اس کی حضرت بل کی تقریر کی محض ایک مفصل تشریح ہے۔ اس نے حکومت کے خلاف مبینہ الزامات لگاتے ہوئے ہز ہائینس مہاراجہ بہادر کی ذات کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ گورنمنٹ سے نیشنل کانفرنس منسٹری کے اخراج میں ہز ہائینس کا بھی ہاتھ تھا۔ جہاں تک آئینی سرداری یا استقراریہ پر مبنی حکمرانی کا تعلق ہے۔ جیسا کہ اس نے تجویز کیا ہے۔ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ یہ نظریہ اب خیالی دنیا کی ملکیت ہے۔ موجودہ سیاسیات میں اس کی کوئی جگہ نہیں۔ حکومتی اقتدار میں یہ بھی کہوں گا کہ ریاست کے سردار اعلیٰ کی حیثیت سے بھی انکاری ہو کر ملزم اور اس کی پارٹی نے اپنے پیروؤں کی قوت کو بے سود اور تباہ کن راہ پر لگایا ہے۔ "مہاراجہ بہادر کے زیر سایہ ذمہ دار نظام حکومت" نیشنل کانفرنس کا پہلا اصول تھا۔ اس اصول کی قبولیت اس کی ممبرشپ کی شرط تھی۔ نیشنل کانفرنس نے رسمی طور اس اصول کو رد نہیں کیا ہے۔ شیخ محمد عبداللہ نے سشن جج کشمیر کے سامنے اپنے مقدمے کے دوران میں بیان کیا کہ وہ اب بھی ہز ہائینس کے زیر سایہ ذمہ دار نظام حکومت کا علمبردار ہے۔ اور یہ کہ عہد نامہ امرتسر کے متعلق اس کی بحث محض علمی نوعیت کی تھی۔ یہ امید ظاہر کی جا سکتی ہے کہ جب نیشنل کانفرنس کے ممتاز ممبر پھر سے سیاسی زندگی میں حصہ لیں گے۔ وہ اسی پوزیشن پر قائم رہیں گے۔ اسی طرح پر نیشنل کانفرنس کے اکثر دوست "کشمیر چھوڑ دو" میں حکمران کے خلاف تند و تیز تحریر کو اعتدال سے ایک وقتی گریز تصور کریں گے۔

ملزم کی تقریر کو زیر نظر رکھا جائے۔ یا اس کے سیاق و سباق کو دیکھا جائے۔ تو یہ

تقریر حکمران کے ساتھ لوگوں کی وفاداری پر کمزور کن اثر ڈال سکتی ہے۔ اور ان کے دلوں میں حکمران اور ریاست میں قانون پر مبنی حکومت کے خلاف نفرت پیدا کر سکتی ہے یہ تقریر لوگوں کو قانون شکنی کی دعوت دیتی ہے۔ اور یہ تقریر صریحاً جموں و کشمیر ڈیفنس رولز کی دفعات ۳۲ اور ۵ کے تحت آتی ہے۔

لہٰذا میں ملزم مولوی محمد سعید کو جموں و کشمیر ڈیفنس رولز کی دفعہ ۳۲ کے تحت ایک جرم کا اور دفعہ ۵ کے تحت دوسرے جرم کا مرتکب پاتا ہوں۔ اور اس کو ہر دو جرم کی پاداش میں ایک ایک سال قید محض اور دو دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا دیتا ہوں۔ قید کی دونوں سزائیں بیک وقت شروع ہوں گی۔ ہر رقم جرمانہ کی عدم ادائیگی کی صورت میں ملزم کو مزید تین تین ماہ قید محض کی سزا بھگتنی ہوگی۔ اور یہ قیدیں بھی بیک وقت شروع ہوں گی۔

آج میں نے ملزم کو اس سے پیشتر اسی روز کے واقعات پر مبنی ایک اور مقدمہ میں سزا دی ہے۔ ملزم کو دونوں کیسوں میں دی ہوئی سزائیں بیک وقت شروع ہوں گی۔

اس کے علم و فضل اور مرتبہ کے پیش نظر میں سفارش کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ ایک اسپیشل کلاس قیدی کا سا سلوک کیا جائے۔

(دستخط) اندو بھوشن (بحروف انگریزی)

۲۰ اسوج سنہ ۲۰۰۳

سٹی منصف۔ مجسٹریٹ درجہ اول۔ سری نگر

6513.